دینی مسائل

(سوالات وجوابات)

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور - (پاکستان)

نام کتاب: خواتین اور دینی مسائل

مصنف: سید ابو الاعلیٰ مودودی

اشاعت:	ایڈیشن	تعداد
	۱ تا ۸۔ مئی ۱۹۸۷ء تا اکتوبر ۱۹۹۸ء	۸۱۸۰۰
	۹۔ مئی ۲۰۰۰ء	۱۱۰۰

اہتمام: پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

فون: 7664504-7669546 فیکس: 7658674

ای میل islamic@ms.net.pk

مطبع: تکبیر پریس، لاہور

قیمت: -/57 روپے

فہرست مضامین

عقائد

عبادات اور فقہی مسائل

معاشرتی مسائل

متفرق مسائل

دیباچہ

ماہنامہ ترجمان القرآن میں مختلف مسائل وموضوعات پہ لوگوں کے سوالات اور مولانا سید ابوالاعلیٰؒ کے جوابات رسائل مسائل کے نام سے چار مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جن کے متعدد ایڈیشن اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ان کی علمی افادیت اور عملی رہنمائی کو حسنِ قبول حاصل ہوا ہے۔ سوالات مختلف تمدنی، سیاسی، معاشی اور فقہی معاملات وامور پر مشتمل ہیں اور مولانا مرحوم نے ان کے ایسے جامع اور مختصر جوابات دیئے ہیں کہ سوال کرنے والوں کی ہی اُلجھن دور نہیں ہو جاتی عام قارئین کو بھی معلومات و رہنمائی کا ایک بیش بہا خزانہ میسر آجاتا ہے۔

اِن سوالات وجوابات میں بے شمار ایسے مسائل بھی زیرِ بحث آئے ہیں جو خواتین سے متعلق ہیں یا جن کے بارے میں خواتین بھی علم ورہنمائی چاہتی ہیں۔ رسائل ومسائل کی چاروں جلدوں میں ایسے مسائل بکھرے ہوئے تھے لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ خواتین کو یکجا اپنی دلچسپی کے تمام مسائل اور ان کا حل اس طرح مل جائے کہ انہیں رسائل ومسائل کی مختلف جلدوں میں انہیں تلاش نہ کرنا پڑے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہم نے رسائل ومسائل کی چاروں جلدوں سے انتخاب کر کے خواتین کی دلچسپی کے سوالات وجوابات کو الگ مختلف عنوانات کے تحت مرتب کر دیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس مجموعہ کو جسے ہم نے "خواتین اور دینی مسائل" کا نام دیا ہے، خواتین کے حلقے میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی اس کوشش کو اور زیادہ مفید و مؤثر بنانے کے سلسلے میں مشوروں کا نہ صرف خیر مقدم کیا

جائے گا بلکہ یہ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ ایڈیشن ان مشوروں کی روشنی میں زیادہ بہتر اور مفید تر بنا کر پیش کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو جاننے اور اس کو اختیار کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عبدالوحید خاں
۵ فروری ۱۹۸۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقائد

وہابی اور وہابیت

سوال :۔ فرقہ وہابیہ کا بانی کون تھا ؟ اس کے مخصوص عقائد کیا تھے ؟ ہندوستان میں اس کی تعلیمات کس طرح شائع ہوئیں ؟ کیا علمائے اسلام نے اس کی تردید نہیں کی ؟ اگر کی ہے تو کس طریقہ پر ؟ آیا اس فرقہ نے اشاعتِ اسلام میں حصہ لیا ہے یا مخالفتِ اسلام میں ؟

جواب :۔ وہابی دراصل کسی فرقہ کا نام نہیں ہے۔ محض طنز اور طعن کے طور پر ان لوگوں کے لیے ایک نام رکھ دیا گیا ہے جو یا تو اہلِ حدیث ہیں، یا محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو ہیں۔ اہلِ حدیث کا مسلک تو قدیم ہے۔ ائمہ اربعہ کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ اور یہ اُن لوگوں کا گروہ ہے جو کسی امام کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے خود حدیث و قرآن سے احکام کی تحقیق کرتے ہیں۔ رہے محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو۔ تو وہ دراصل حنبلی طریقہ کے لوگ ہیں۔ ان کی فقہ اور ان کے عقائد وہی ہیں جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے تھے۔ ہندوستان میں یہ مؤخر الذکر گروہ غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہاں وہابی کہا جاتا ہے وہ دراصل پہلے گروہ کے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے اول اول نہایت

اچھا کام کیا اور اب بھی ان میں اچھے افراد پائے جاتے ہیں ۔ مگر ان میں بہت سے جاہل اور جھگڑالو آدمی بھی شامل ہو گئے ہیں جو خوانخواہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر بحث و مناظرہ کا بازار گرم کرتے پھرتے ہیں ۔ اور ایسے ہی جاہل خود حنفی کہلانے والے گروہ میں بھی بکثرت موجود ہیں ۔ یہ ساری مناظرہ و مباحثہ اور فرقہ بازی کی گرمی بازار انہی دونوں فریقوں کی برکت ہے ۔

سوال :۔ کیا حدیث میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نجد سے ایک فتنہ اٹھے گا ؟ کیا یہ حدیث مذکورۂ بالا فرقہ پر منطبق ہوتی ہے ؟

جواب :۔ نجد یا مشرق کی طرف سے ایک فتنہ اٹھنے کی خبر تو حدیث میں دی گئی ہے مگر اس کو محمد بن عبدالوہاب پر چسپاں کرنا محض گروہ بندی کے اندھے جوش کا نتیجہ ہے ۔ ایک فریق جب دوسرے فریق سے لڑنا چاہتا ہے تو ہر ہتھیار اس کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ خدا اور رسول کو بھی ایک فریق جنگ بنانے میں دریغ نہیں کرتا ۔

(ترجمان القرآن ، رجب شوال ۱۳۶۰ھ ، جولائی اکتوبر ۱۹۴۱ء)

حضرت حوّا کی پیدائش

سوال :۔ حضرت حوّا کی پیدائش کے متعلق تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۱۹ میں جناب نے تصریح کی ہے کہ آدم کی پسلی سے نہیں ہوئی ۔ حدیث بخاری خُلقت من ضلع آدم کا کیا جواب ہوگا ؟

جواب :۔ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حوّا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا ۔ زیادہ سے زیادہ اس خیال کی تائید میں جو چیز پیش کی جا سکتی ہے وہ قرآن کا یہ ارشاد ہے کہ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النساء ۔ ۱) اور جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (الاعراف ۔ ۱۸۹) لیکن

ان دونوں آیتوں میں مِنْهَا کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا" اور یہ بھی کہ "اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا"۔ ان دونوں میں سے کسی معنی کو بھی ترجیح دینے کے لیے کوئی دلیل قرآن کی ان آیتوں میں نہیں ہے بلکہ قرآن کی بعض دوسری آیتیں تو دوسرے معنی کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورۂ روم میں فرمایا وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا (آیت ۲۱)۔ یہی مضمون سورۂ نحل آیت ۷۲ میں بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں آیتوں میں مِنْ اَنْفُسِکُمْ کے معنی مِنْ جِنْسِکُمْ ہی لیے جائیں گے، نہ یہ کہ تمام انسانوں کی بیویاں ان کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلے معنی کو ترجیح دینے کے لیے کوئی بنیاد مل سکتی ہے تو وہ حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایات ہیں جو بخاری و مسلم نے نقل کی ہیں مگر ان کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں کہ:

المرأة کالضلع ان اقمتها کسرتها وان استمتعت بها وفیها عوج۔

عورت پسلی کے مانند ہے اگر تو اسے سیدھا کرے گا تو توڑ دے گا اور اگر اس سے فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اندر کجی باقی رہتے ہوئے ہی فائدہ اٹھا سکے گا۔

اور دوسری روایت میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

استوصوا بالنساء خیرًا فانهن خلقن من ضلع وان اعوج شیئ فی الضلع اعلاه فان ذهبت

تقیمہ کسرتہ وان ترکتہ لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء خیرا ۔

عورتوں کے معاملے میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہوتا ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے تو اس کو توڑ دے گا اور اگر چھوڑ دے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ لہذا عورتوں کے معاملہ میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو۔

ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی حدیث تو عورت کو پسلی سے محض تشبیہ دے رہی ہے۔ اس میں سرے سے یہ ذکر ہی نہیں ہے کہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ البتہ دوسری حدیث میں پسلی سے پیدائش کی تصریح ہے۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس میں حضرت حوا، یا پہلی عورت یا ایک عورت کی نہیں بلکہ تمام عورتوں کی پیدائش پسلی ہی سے بیان کی گئی ہے[1] کیا فی الواقع دنیا کی تمام عورتیں پسلیوں ہی سے پیدا ہوا کرتی ہیں ؟

---

[1] یہ الفاظ بخاری، کتاب النکاح والی روایت کے ہیں۔ دوسری روایت میں جو امام بخاری نے کتاب احادیث الانبیاء میں نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں : فان المرأۃ خلقت من ضلع " کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے " اس صورت میں المرأۃ سے مراد ہر عورت، اور عورتوں کی پوری صنف ہو گی نہ کہ وہ ایک خاص عورت جو دنیا میں سب سے پہلے پیدا کی گئی۔ اس سلسلے میں یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سائل نے بخاری کے حوالے سے خلقت من ضلع آدم کے الفاظ نقل کیے ہیں حالانکہ بخاری میں کسی جگہ بھی یہ الفاظ نہیں آئے ہیں۔

اگر یہ بات نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خُلِقْنَ مِنْ ضلع کے الفاظ اس معنی میں نہیں ہیں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی یا بنائی گئی ہیں، بلکہ اس معنی میں ہیں کہ ان کی ساخت میں پسلی کی سی کجی ہے۔ اس کی مثال قرآن مجید کی یہ آیت ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے، بلکہ یہ ہیں کہ انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پسلی سے حضرت حوّا کی پیدائش کا خیال قرآن ہی میں نہیں حدیث میں بھی کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ روایت نقل ہو کر مسلمانوں میں شائع ہوئی اور بڑے بڑے لوگوں نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ اپنی کتابوں میں ثبت کر دیا۔ مگر کیا یہ صحیح ہے کہ اللہ اور رسول کی سند کے بغیر محض بڑے لوگوں کے اقوال کی بنا پر اسے ایک اسلامی عقیدہ ٹھیرا دیا جائے اور جو کوئی اس پر ایمان نہ لائے اسے گمراہ قرار دیا جائے؟

ایصالِ ثواب

سوال:۔ مندرجۂ ذیل امور میں آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ مجھے امید ہے کہ حسبِ معمول واضح جواب عنایت فرمادیں گے۔

۱۔ رسائل ومسائل حصہ دوم صفحہ ۲۹۹ پر "نذر ونیاز اور ایصالِ ثواب" کے عنوان کے تحت جو جواب آپ نے رقم فرمایا ہے اس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ آپ اس امر کے قائل ہیں کہ مالی عبادت سے ایصالِ ثواب ہو سکتا ہے مگر بدنی عبادت سے نہیں۔ اور پھر آپ مالی انفاق کے بھی متوفی عزیز کے لیے

نافع ہونے کو اللہ تعالیٰ کی مرضی پہ موقوف قرار دے رہے ہیں۔ کیا آپ کے استدلال کی یہ وجہ ہے کہ اس امر کی بابت کوئی صراحت قرآن وحدیث میں نہیں ہے کہ بدنی عبادت میں ایصالِ ثواب ممکن ہے؟ یا کوئی اور سبب ہے؟

آپ خود ایصالِ ثواب کرنے والے کے لیے تو انفاق کو بہرحال نافع قرار دے رہے ہیں مگر متوفی عزیز کے لیے نافع ہونے کو اللہ کی مرضی پہ موقوف قرار دے رہے ہیں۔ اس تفریق کی اصل وجہ کیا ہے۔

۲: کیا ہر شخص ہر دوسرے متوفی شخص کو (خواہ متوفی اس کا عزیز ہو یا نہ ہو، یا متوفی نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی تربیت میں حصہ لیا ہو یا نہ) مالی انفاق کا ثواب پہنچا سکتا ہے یا کہ اس کے لیے آپ کے نزدیک چند قیود و شرائط ہیں؟ ازراہِ کرم اپنی رائے تحریر فرما دیں۔

جواب:۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات نمبروار درج ذیل ہیں:۔

(۱) دراصل تو قرآن وحدیث سے عام قاعدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا اپنا عمل ہی اس کے لیے مفید ہے، ایک شخص کا عمل دوسرے کے لیے آخرت میں مفید نہ ہوگا۔ لیکن بعض احادیث سے یہ استثنائی صورت بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایصالِ ثواب بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی جتنی احادیث بھی ہمیں ملی ہیں ان سب میں کسی خالص بدنی عبادت کا ذکر ہے جو یا تو صرف مالی عبادت ہے جیسے صدقہ، یا مالی و بدنی عبادت ملی جلی ہے، جیسے حج۔ اسی بنا پر فقہاء میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ اسے مالی اور بدنی عبادات دونوں میں جاری کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس کو ان عبادات کے لیئے

مخصوص کرتا ہے جو یا تو خالص مالی عبادات ہیں یا جن میں بدنی عبادت مالی عبادت کے ساتھ ملی ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا مسلک اس لیے مرجح ہے کہ قاعدۂ کلیہ میں اگر کوئی استثناء کسی حکم سے نکلتا ہو تو اس استثناء کو اسی حد تک محدود رکھنا چاہیئے جس حد تک وہ حکم سے نکلتا ہے۔ اسے عام کرنا میری رائے میں درست نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے گروہ کے مسلک پر عمل کرتا ہے تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ شریعت میں اس کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اختلاف صرف ترجیح کا ہے۔

رہی یہ بات کہ ایصالِ ثواب کا میت کے لیے نافع ہونا یا نہ ہونا اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، تو اس کا سبب دراصل یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کی نوعیت محض ایک دعا کی ہے۔ یعنی ہم اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ نیک عمل جو ہم نے تیری رضا کے لیے کیا ہے اس کا ثواب فلاں مرحوم کو دیا جائے۔ اس دعا کی حیثیت ہماری دوسری دعاؤں سے مختلف نہیں ہے۔ اور ہماری سب دعائیں اللہ کی مرضی پر موقوف ہیں۔ وہ مختار ہے کہ جس دعا کو چاہے قبول فرمائے اور جسے چاہے قبول نہ فرمائے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کے لیے ایصالِ ثواب کریں جو اللہ کی نگاہ میں مومن ہی نہ ہو، یا سخت مجرم ہو اور اللہ اُسے کسی ثواب کا مستحق نہ سمجھے۔

ایصالِ ثواب کرنے والے نے اگر واقعی کوئی نیک عمل کیا ہو تو اس کا اجر بہر حال ضائع نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اگر متوفی کو ثواب نہ پہنچائے گا تو نیکی کرنے والے کے حساب میں اس کا اجر ضرور شامل کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی شخص کے نام منی آرڈر بھیجیں۔ اگر وہ منی آرڈر اس کو نہ دیا گیا ہو تو لازماً آپ کی رقم آپ کو واپس ملے گی۔

یا مثلاً آپ جیل میں کسی قیدی کو کھانا بھیجیں ۔ اگر حکومت یہ مناسب نہیں سمجھتی کہ ایک ظالم مجرم کو نفیس کھانے کھلائے جائیں تو وہ آپ کا بھیجا ہوا کھانا پھینک نہیں دے گی، بلکہ آپ کو واپس کر دے گی ۔

۲ ۔ ایصالِ ثواب ہر ایک کے لیے کیا جا سکتا ہے، خواہ متوفی سے کوئی قرابت ہو یا نہ ہو اور خواہ متوفی کا کوئی حصہ آدمی کی تربیت میں ہو یا نہ ہو ۔ جس طرح دعا ہر ایک کے لیے کی جا سکتی ہے اسی طرح ایصالِ ثواب بھی ہر ایک کے لیے کیا جا سکتا ہے ۔

(ترجمان القرآن ۔ فروری ۱۹۶۱ء)

اصحابِ قبور سے درخواستِ دُعا

سوال :۔ کسی بزرگ کی قبر پہ جا کر اس طرح کہنا کہ "اے ولی اللہ! آپ ہمارے لیے اللہ سے دعا کریں" کیا درست ہے ؟

جواب :۔

کسی بزرگ سے اپنے حق میں دعائے خیر کی درخواست کرنا بجائے خود کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے ۔ آدمی خود بھی اللہ سے دُعا مانگ سکتا ہے، اور دوسروں سے بھی کہہ سکتا ہے کہ میرے لیے دعا کرو ۔ لیکن وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر یہ درخواست پیش کرنا معاملہ کی نوعیت کو بالکل ہی بدل دیتا ہے ۔ قبر پہ یہ بات کہنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ۔ ایک یہ کہ آپ اپنے دل میں، یا چپکے چپکے ایسا کہیں ۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ ان بزرگوں کی سماعت کی شان وہی کچھ سمجھ رہے ہیں جو اللہ کی ہے کہ :

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔

تم اپنی بات آہستہ سے کہو یا زور سے، وہ تو دلوں کا حال بھی جانتا ہے ۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ زور زور سے اُن ولی اللہ کو پکار کر کہیں ۔ اس صورت میں اعتقاد کی خرابی تو لازم نہ آئے گی مگر یہ اندھیرے میں تیر چلانا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ پکار رہے ہوں اور وہ نہ سُن رہے ہوں ۔ کیونکہ سماعِ موتیٰ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا سماع تو ممکن ہو ۔ مگر اُن کی روح وہاں تشریف نہ رکھتی ہو، اور آپ خواہ مخواہ خالی مکان پہ آوازیں دے رہے ہوں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی روح تشریف فرما تو ہو مگر وہ اپنے رب کی طرف مشغول ہوں، اور اپنی غرض کے لیے چیخ چیخ کر اُن کو الٹی اذیت دیں ۔ دنیا میں کسی نیک آدمی سے دُعا کرانے کے لیے آپ جاتے ہیں تو مہذب طریقہ سے پہلے ملاقات ہوتی ہے پھر آپ عرضِ مدعا کرتے ہیں ۔ یہ تو نہیں کرتے کہ مکان کے باہر کھڑے ہو کر بس چیخنا شروع کر دیا ۔ کچھ پتہ نہیں کہ اندر ہیں یا کہ نہیں ہیں ۔ ہیں تو آرام میں ہیں یا کسی کام میں مشغول ہیں، یا آپ کی بات سننے کے لیے خالی بیٹھے ہیں ۔

اب غور کیجیے کہ وفات یافتہ بزرگوں کے معاملہ میں جب ہمارے لیے اُن کے احوال معلوم کرنے اور اُن سے بالمشافہ ملاقات کرنے کا موقع نہیں ہے تو اُن کے مکانوں پہ جا کر اندھا دھند چیخ پکار شروع کر دینا آخر کس معقول آدمی کا کام ہو سکتا ہے دعا کروانے کا یہ طریقہ اگر قرآن و حدیث میں سکھایا گیا ہوتا، یا اس کا کوئی ثبوت موجود ہوتا کہ صحابہ کے عہد میں یہ رائج تھا، تب تو بات صاف تھی ۔ بڑے اطمینان سے

ساتھ یہ کام کیا جا سکتا تھا لیکن جب وہاں اس کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا تو آخر ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی ایک صورت تو صریحاً صفاتِ الٰہی کے تصور سے ٹکراتی ہے، اور دوسری صورت علانیہ غیر معقول نظر آتی ہے۔

بزرگوں کی حرمت وجاہ سے توسّل

سوال :-

یہ جو دعاؤں میں "بجاہِ فلاں" اور "بحرمتِ فلاں" کا اضافہ ملتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ سنتِ رسولؐ کیا بتاتی ہے؟ صحابہ کا کیا معمول رہا ہے؟ اور اس طرح (بجاہ ـــ حرمت) دعا مانگنے سے کوئی دینی قباحت تو لازم نہیں آتی؟

جواب :-

دعا میں اللہ تعالیٰ کو کسی کے جاہ وحرمت کا واسطہ دینا وہ طریقہ نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسولِ پاکؐ نے ہم کو سکھایا ہے۔ قرآن تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس تخیل سے بالکل خالی ہے۔ حدیث میں بھی اس کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے بھی کسی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ انہوں نے دعا میں یہ طریقہ خود اختیار کیا ہو یا دوسروں کو اس کی تعلیم دی ہو۔ معلوم نہیں کہ مسلمانوں میں یہ تخیل کہاں سے آگیا کہ ربّ العالمین کے حضور دُعا مانگتے وقت اسے کسی بندہ کی جاہ و حرمت کا حوالہ دیں یا اس سے یہ عرض کریں کہ اپنے فلاں بندے کے طفیل میری حاجت

پوری کر دے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا کرنا ممنوع ہے۔ میں صرف دو باتیں کہتا ہوں۔ ایک یہ کہ ایسا کرنا اُس طریقہ کے مطابق نہیں ہے جو رب العالمین نے خود ہمیں دعا مانگنے کے لیے سکھایا ہے۔ اور اُس طریقِ دعا سے بھی مطابقت نہیں رکھتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے براہِ راست شاگردوں کو بتایا تھا۔ اس لیے اس سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیا علیہم السلام آخر یہی بتانے کے لیے تو آئے تھے کہ خدا اور بندوں کے درمیان ربط و تعلق کی صحیح صورت کیا ہے' اور جب انہوں نے اس کی یہ صورت نہ خود اختیار کی' نہ کسی کو سکھائی' تو جو شخص بھی اسے اختیار کرے گا وہ معتبر چیز کو چھوڑ کر غیر معتبر چیز اختیار کرے گا۔

دوسری بات میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے تو اس طریقِ دعا میں بڑی کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے معنی سے صرفِ نظر کرلے اور اس میں کراہیت کا وہ پہلو محسوس نہ کرے جو مجھے نظر آتا ہے۔ میں جب اِس طرزِ دعا کے مضمرات پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے کچھ ایسی تصویر آتی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑی سخی داتا ہستی ہے' جس کے دروازے سے ہر کہ ومہ کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں' جس کا فیض عام ہے' جس کا دربار کھلا ہے' جس سے ہر مانگنے والا مانگ سکتا ہے' اور کسی پر اس کی عطا و بخشش بند نہیں ہے۔ ایسی ہستی کے حضور ایک شخص آتا ہے اور اس سے سیدھی طرح یہ نہیں کہتا کہ اے کریم و رحیم! میری مدد کر۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ اپنے فلاں دوست کی خاطر میری حاجت پوری کردے۔ مانگنے کے اس انداز میں یہ بدگمانی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی صفت رحم و کرم کی وجہ سے کسی کی دستگیری کرنے والا نہیں ہے بلکہ اپنے دوستوں اور چہیتوں اور مقربوں کی خاطر

احسان کر دیا کرتا ہے۔ ان کا واسطہ نہ دیا جائے تو گویا آپ اس کے ہاں سے کچھ پانے کی امید نہیں رکھتے اور بجاہِ فلاں کہہ کر مانگنے میں تو معاملہ بدگمانی سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ گویا آپ اس پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں فلاں آدمی کا متوسّل آیا ہوں، میری درخواست کو کسی بے وسیلہ آدمی کی سی درخواست سمجھ کر نہ ٹال دیجئے گا۔ اگر یہ اس طرزِ دعا کے مضمرات نہ ہوں تو مجھے سمجھا دیا جائے۔ بڑی خوشی ہوگی کہ میرے دل کی کھٹک اس معاملہ میں نکل جائے گی۔ لیکن اگر اس کے واقعی مضمرات یہی ہوں تو میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کا صحیح تصور رکھتا ہو وہ ایسا طرزِ دعا اختیار کرنے کا خیال بھی کیسے کر سکتا ہے۔

اسی طرح کے مضمرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے بھی اس طریقِ دعا کو مکروہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ میں یہ قول موجود ہے۔

ویکرہ ان یقول الرجل فی دعائہ بحق فلان او بحق انبیاءك ورسلك لانہ لاحق للمخلوق علی الخالق۔ (کتاب الکراہیۃ، مسائل متفرقہ)

اور یہ مکروہ ہے کہ آدمی اپنی دعا میں بحقِ فلاں یا بحقِ انبیاء و رُسل کہے، کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے۔

("فاران" توحید نمبر)

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۱۳۷۷ھ ۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۷ء)

مسئلہ حیات النبیؐ

سوال :-

آج کل دینی حلقوں کی فضا میں حیات النبی کا مسئلہ ہر وقت گونجتا رہتا ہے اور علمائے کرام کے نزدیک موضوع سخن بنا ہوا ہے۔ شروع میں تو فریقین اپنی اپنی تائید میں علمی دلائل دے رہے تھے مگر اب تکفیر بازی، طعن و تشنیع اور پگڑی اچھالنے تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ الاماشاء اللہ۔ بعض مساجد میں بآواز بلند کہا جا رہا ہے کہ انبیاء اسی طرح زندہ ہیں جس طرح کہ دنیا میں زندہ تھے اور حیات النبی کا منکر کافر ہے۔ بعض دوسرے حضرات حیاتِ جسمانی کے عقیدے کو مشرکانہ بلکہ منبع شرک قرار دے رہے ہیں۔ جہاں تک فضائل کا تعلق ہوتا ہے وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ بات جو قرآن کریم اور خبر متواتر کے خلاف نہ ہو، مانی جا سکتی ہے۔ لیکن جب بات عقیدہ کی حد تک پہنچ جائے تو وہاں قطعی الثبوت دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ براہ کرم میرے دل کی تسلی و تشفی کے لیے مسئلہ حیات النبیؐ پر روشنی ڈالیں۔

جواب :-

مسئلہ حیات النبیؐ کے بارے میں آج کل جس طریقہ پر علمائے کرام کے مابین بحث چل رہی ہے اس کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کا کچھ حاصل ہی ہے۔ عقیدے کی حد تک ہمارا اس بات پر ایمان کافی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہیں، اور

آپ کی ہدایت ابد تک کے لیے کامل ہدایت ہے۔ عمل کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ہم آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں، جسے معلوم کرنے کی خاطر قرآن اور سنت ہمارا مرجع و منبع ہے۔ اب آخر اس بحث کی حاجت ہی کیا ہے کہ نبی کریمؐ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کس معنی میں زندہ ہیں۔ برزخی و روحانی حیات ہو یا جسمانی حیات، بہر حال اس امرِ واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرتؐ کا ۱۱ھ میں وصال ہو چکا ہے۔ امت کی ہدایت کے لیے آپ بنفسِ نفیس ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، اور آپ کا اتباع کرنے کے لیے ہمیں آپؐ کی ذاتِ اقدس کی طرف رجوع کرنے کے بجائے قرآن اور حدیث ہی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ حیاتِ برزخی یا حیاتِ جسمانی کی بحث کا کوئی بھی فیصلہ ہو، اس سے اِس امرِ واقعہ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

پھر یہ بحث اس لیے بھی غیر ضروری اور لاطائل ہے کہ ہم اس خاص معاملے میں کوئی متعین عقیدہ رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکلف ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس مسئلے سے بالکل خالی الذہن ہو یا اس میں کوئی رائے قائم کیے بغیر مر جائے، تو اس کے ایمان میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا، نہ آخرت میں اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے حیاتِ نبی کے برزخی یا جسمانی ہونے کے بارے میں کیا عقیدہ رکھا تھا۔ قرآن و حدیث میں کوئی ایسی واضح اور قطعی ہدایت اس باب میں نہیں دی گئی جو ہمیں ایک خاص عقیدہ رکھنے کا پابند کرتی ہو، نہ یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کے درمیان زیرِ بحث تھا، نہ آنحضورؐ کے جانشینوں نے کسی کو اس معاملے میں کوئی خاص عقیدہ رکھنے کی کبھی تلقین کی۔

مَیں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ حیات النبیؐ کے مسئلے میں حضرات علماء وہی غلطی کر رہے ہیں جو خلقِ قرآن کے مسئلے میں خلیفہ مامون نے کی تھی۔ یعنی جس چیز کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسلام کا ایک عقیدہ اور ایمانیات کا ایک رکن نہیں قرار دیا تھا اور نہ جسے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کی نجات کا مدار رکھا، اور نہ جس پر اعتقاد رکھنے کی خلق کو دعوت دی تھی، اسے خواہ مخواہ عقیدۂ اسلام اور رکنِ ایمان بنایا جا رہا ہے، اس کے ماننے یا نہ ماننے کو مدارِ نجات قرار دیا جا رہا ہے، اس پر اعتقاد رکھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور اعتقاد نہ رکھنے والوں کی تکفیر و تفسیق کی جا رہی ہے۔ دین میں جن چیزوں کی یہ حیثیت تھی ان کو صاف صاف اور حتمی طور پر بیان کر دینے میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور علیٰ رؤس الاشہاد ان کی طرف دعوت دی ہے۔ یہ مسئلہ ہرگز ان مسائل میں سے نہیں ہے اور اسے زبردستی ان مسائل میں شامل کرنا یا ان کا سا درجہ دینا کلیتہً غلط کارروائی ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسئلے میں قطعاً خالی الذہن ہو یا اس کے بارے میں کوئی عقیدہ و رائے نہ رکھتا ہو۔ اس سے قیامت میں کوئی بازپرس نہ ہو گی اور اس کے انجامِ اخروی پر اس عدمِ رائے یا خلوئے ذہن کا کوئی اثر مترتب نہ ہو گا۔ البتہ خطرے میں وہ شخص ہے جو اس مسئلے میں ایک عقیدہ قائم کرتا ہے اور اس کی تبلیغ کرتا ہے، کیونکہ اس کے عقیدے میں صحت اور عدمِ صحت دونوں کا احتمال ہے۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

علمِ غیب، حاضر و ناظر اور سجود لغیر اللہ

سوال:۔

تفہیم القرآن زیرِ مطالعہ ہے۔ شرک کے مسئلہ پہ ذہن اُلجھ گیا ہے۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔ تفہیم القرآن کے بغور مطالعہ سے یہ امر ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفات میں عالم الغیب ہونا اور سمیع و بصیر ہونا (جس کے تحت ہمارے مروّجہ الفاظ حاضر و ناظر بھی آجاتے ہیں) بھی شامل ہیں۔ خدا کے سوا کسی کو بھی ان صفات سے متصف سمجھنا شرک ہے۔ اور مخلوق میں سجدہ و رکوع وغیرہ بھی ذاتِ باری سے مختص ہیں۔ شرک کو خداوند نے جرمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جرم کا وہ خود کسی کو حکم نہیں دے سکتا۔ مگر فرشتوں کو آدمؑ کے لیے سجدہ کا حکم دیا۔ اسی طرح کوئی نبی نہ تو شرک کرتا ہے اور نہ کرواتا ہے۔ مگر حضرت یوسفؑ کے سامنے ان کے بھائیوں اور والدین نے سجدہ کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کے لیے شرک ہے تو مندرجہ بالا واقعات کی کیا توجیہ ہو گی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ علمِ غیب اگر خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے تو یہ کسی بھی مخلوق میں نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن قرآن و حدیث اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ انبیاء و رُسُل کو علمِ غیب ہوتا ہے۔ پھر کسی مخلوق میں یا کسی فرد میں اس صفت کو ہم تسلیم کریں تو مرتکب شرک کیوں ہوتے

ہیں؟ اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کا علم دیا ہے تو آخر اسے مشرک کیوں کہا جائے؟ جن لوگوں کے خلاف اسی بنا پر شرک کے ارتکاب کا فتویٰ لگایا جاتا ہے وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ علم غیب کو ذاتی یا نفسی نہیں کہتے بلکہ خدا کا دین قرار دیتے ہیں۔ ان کا اور دوسرے علماء کا اگر اختلاف ہے تو صرف کم یا زیادہ پر ہے۔ جب مسئلہ کم و بیش کا ہی ہے تو پھر فتویٰ شرک کیوں؟

حاضر و ناظر کی صفت بھی خداوند تعالیٰ سے مختص قرار دی جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں اور جنوں کی روحوں کو قبض کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور حاضر و ناظر ہونا خدا کی مخصوص صفت ہے۔ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرض کی انجام دہی کے لیے اپنی خاص صفت فرشتہ میں ودیعت کر رکھی ہے تو جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں صفت حاضر و ناظر ہونا اور خدا کی طرف سے عطا کیا جانا مانتے ہیں آخر انہیں مشرک کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب:

آپ نے شرک کے مسئلے میں اپنی جو اُلجھنیں بیان فرمائی ہیں وہ تفہیم القرآن کے مسلسل مطالعہ سے بآسانی رفع ہو سکتی ہیں۔ میرے لیے ایک خط

ہیں ان کو تفصیلاً رفع کرنا مشکل ہے۔ تاہم چونکہ "شرک" کا معاملہ بڑا ہی نازک اور خطرناک ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس اُلجھن میں زیادہ دیر تک مبتلا رہیں، اس لیے اختصار کے ساتھ چند الفاظ میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ سجدہ بجائے خود شرک نہیں ہے بلکہ شرک کی علامت ہے۔ اصل میں شرک تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک فی الذات یا فی الصفات یا فی الحقوق ٹھیرانا ہے۔ سجدہ اگر اس طرح کے کسی عقیدے کے ساتھ ہو تو شرک ہے، ورنہ اس فعل سے چونکہ مشرکین کے ساتھ عملاً مشابہت ہوتی ہے، اس لیے اسے بجائے خود شرک ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس مشابہت کی بنا پر ممنوع ٹھیرایا گیا ہے۔ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خود حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس لیے فرشتوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ عزوجل کے حکم صریح کی تعمیل میں تھا۔ بطور خود وہ آدم کو قابلِ پرستش یا قابلِ تعظیم سمجھ کر نہیں جھک گئے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں شرک کا کوئی شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

حضرت یوسفؑ کے سامنے والدین اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا وہ اُس رویائے صادقہ کی بنا پر تھا جو قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے خود دکھایا تھا، جسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے الٰہی اشارہ قرار دیا تھا (سورۂ یوسف آیات ۴ تا ۶)، اور جس کو حضرت یوسفؑ نے بھی آخر کار اسی خواب کا مصداق ٹھیرایا (سورۂ یوسف آیت ۱۰۰)۔ اس لیے یہاں بھی جو کچھ ہوا اللہ کے حکم سے ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ جو کام اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا جائے وہ شرک نہیں ہو سکتا۔

اب اُس شخص کے معاملے کو لیجیے جو اللہ تعالیٰ کے کسی فرمان کے بغیر کسی بندے کو معظّم و مقدس سمجھ کر بطور خود اس کے آگے سجدہ بجا لائے۔ کیا کسی دلیل سے اِس فعل کو بھی غیر مشرکانہ کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ استدلال صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے پہلے دو نوں معاملوں میں سجود لغیر اللہ کو جائز رکھا ہے تو یہ فعل مطلقاً جائز ہے؟ یا یہ کہ ہم خدا کے حکم کے بغیر خود جسے چاہیں تعظیماً سجدہ کر سکتے ہیں؟ سورہ کہف میں اللہ تعالیٰ اپنے ایک خاص بندے کے متعلق ہمیں بتاتا ہے کہ اُس نے فلاں فلاں مصالح کی بنا پر حکم خداوندی سے کچھ مساکین کی کشتی عیب دار کر دی، اور ایک بچے کو قتل کر دیا۔ کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ہم بھی مصلحت دیکھ کر جس کے مال کو چاہیں نقصان پہنچا دینے اور جسے چاہیں قتل کر دینے کے مجاز ہیں؟ جب اللہ اور اس کے رسولؐ نے نصوصِ شرعیہ کے ذریعہ سے غیر اللہ کے لیے سجدے کو حرام کر دیا ہے، اور دوسروں کی جان و مال میں تصرف کے لیے حدود مقرر کر دیے ہیں، تو کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض خصوصی افعال کو نظیر قرار دے کر اور ان پر قیاس کر کے ان ممنوعات کو اپنے لیے مباح کر لے؟

علمِ غیب کے مسئلے میں یہ بات سب مانتے ہیں کہ کلّی و ذاتی علمِ غیب اللہ کے لیے مخصوص ہے، اور اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ اپنے علمِ غیب کا جو حصہ اور جتنا حصہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے دے سکتا ہے۔ یہ جزئی اور عطائی علمِ غیب اپنی نوعیت میں اُس کلّی و ذاتی علمِ غیب سے مختلف چیز ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے۔ اور کسی بندے کے حق میں اِس دوسری نوعیت کے علمِ غیب کا عقیدہ رکھنا کسی کے نزدیک بھی شرک نہیں ہے۔ دراصل خرابی

جس مقام سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ عقیدت میں غلو کر کے دو ایسی باتیں ایجاد کر لیتے ہیں جو اصل اسلامی عقیدے سے متصادم ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ اس عطائی علمِ غیب کو جزئی نہیں بلکہ کلی بنا دیتے ہیں اور کسی بندے کے حق میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ اسی طرح جمیع ما کان وما یکون کا عالم بنا دیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ہے۔ بظاہر یہاں جزئی و کلی کا فرق دور ہو جانے کے باوجود ذاتی اور عطائی کا فرق نظر آتا ہے۔ جس کی بنا پہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے۔ لیکن تھوڑا سا بھی آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس طرح کا عقیدہ رکھنے میں کتنا عظیم خطرہ مضمر ہے بالفرض اگر یہ جائز ہو کہ اللہ اپنی عطا سے کسی بندے کو اپنے ہی جیسا عالم الغیب و الشہادۃ بنا دے، تو آخر یہ کیوں نہ جائز ہو کہ وہ اُسے اپنی ہی طرح قادرِ مطلق اور حیّ و قیوم اور خالق و رب بھی بنا دے؟ اس کے بعد خدا کی عطا سے کسی بندے کے خدا بن جانے میں آخر کیا رکاوٹ باقی رہ جاتی ہے؟ پھر کیا دو مساوی صفات و اختیارات رکھنے والے خداؤں کے درمیان صرف ذاتی اور عطائی کا فرق شرک سے بچانے کے لیے کافی ہوگا؟

دوسری زیادتی غالی حضرات یہ کرتے ہیں کہ اللہ کے عطیے کو خود بانٹنے کے مختار بن جاتے ہیں۔ یہ بتانا کہ عطا فرمانے والے نے کسی کو کیا عطا کیا ہے اور کیا نہیں کیا ہے درحقیقت خود عطا فرمانے والے ہی کا کام ہے۔ دوسرے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مُعطی کے اپنے بیان کے بغیر وہ بطورِ خود یہ فیصلہ کر دے کہ دینے والے نے کیا کچھ کسی کو عطا فرمایا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب

پاک میں کہیں یہ فرمایا ہو کہ میں نے اپنے فلاں بندے کو جمیع ماکان و مایکون کا عالم بنا دیا ہے، یا اللہ کے رسولؐ نے کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت کی ہو، تو اس کا حوالہ دے دیا جائے، ساری بحث ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر نہ کوئی آیت اس کی تصریح کرتی ہے نہ کوئی حدیث صحیح، تو ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کے اس عطیے کی خبر لوگوں تک آخر کس ذریعہ سے پہنچی ہے؟

اس مسئلے میں یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ عقیدے اور خصوصاً عقیدۂ توحید کا معاملہ بڑا ہی نازک ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر کفر و ایمان اور فلاح و خسران کا مدار ہے۔ اس معاملہ میں یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے کہ مختلف احتمالات رکھنے والی آیات اور احادیث میں سے ایک مطلب نچوڑ کر کوئی عقیدہ بنا لیا جائے اور اسے داخل ایمانیات کر دیا جائے۔ عقیدہ تو صاف اور صریح محکمات سے ماخوذ ہونا چاہیئے جن میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایک بات ماننے کی دعوت دی ہو، اور یہ ثابت ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی تبلیغ فرماتے تھے، اور صحابۂ کرام و تابعین و تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اُس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے یا جمیع ما کان و ما یکون کے عالم ہونے کا عقیدہ یہ نوعیت رکھتا ہے؟ اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تو آخر آپ اپنے آپ کو اس خطرے میں کیوں ڈالیں؟

حاضر و ناظر کے معاملے میں آپ نے ملک الموت کی جو مثال پیش کی ہے اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے، اور نہ کسی حدیث میں یہ آیا ہے کہ ساری کائنات کا ملک الموت ایک ہی ہے۔ یہ بات بھی قرآن سے

نہیں معلوم ہوتی کہ صرف ایک فرشتہ قبضِ ارواح کا کام کرتا ہے۔ بلکہ متعدد مقامات پر روح قبض کرنے والے فرشتوں کا ذکر بصیغہ جمع ہے، مثلاً:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ (النساء: ۹۷)

"جن لوگوں کو ملائکہ نے اس حال میں وفات دی کہ وہ اپنے نفس پہ ظلم کرنے والے تھے اُن سے ملائکہ نے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے"۔

فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ (محمد: ۲۷)

"پھر کیا بنے گی اُس وقت جب ملائکہ ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں کو پیٹتے ہوئے"۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ (النحل: ۳۲)

"جن لوگوں کی رُوحیں ملائکہ اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے ان سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پہ"۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ۔ (الاعراف: ۳۷)

"یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے ان کے پاس رُوحیں قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑے ملک الموت کے تحت بہت سے دوسرے مددگار فرشتے بھی ہیں جو رُوحیں قبض کرنے پر مامور ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ابلیس ایک بڑا شیطان ہے اور اس کی ماتحتی میں بے شمار شیاطین ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ نہ ابلیس جاتا ہے نہ ملک الموت۔

پھر خود اس زمین کی مخلوقات کے بارے میں بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ تمام خشکی وتری اور ہوا کے جانداروں کا ملک الموت وہی ایک ہے جو انسانوں کی جان لینے کے لیے مقرر ہے۔ قرآن میں تو صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ (تمہاری روحیں ملک الموت قبض کرتا ہے)۔ اس سے جو بات نکلتی ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اس زمین پر انسانوں کی رُوحیں قبض کرنے پر ایک فرشتہ مامور ہے۔ اگر بالفرض یہی ایک فرشتہ روئے زمین پر تمام مرنے والوں کی رُوحیں قبض کرتا ہے، تب بھی یہ بہت ہی محدود زمانے کی طاقت ہے جو اللہ نے اپنے اس فرشتے کو عطا فرمائی ہے۔ اس کو آخر اللہ تعالیٰ کی اس لامحدود صفت سے کیا نسبت ہے کہ وہ ساری کائنات میں حاضر وناظر ہے؟ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اور آپ کیا اب قیاسات پر اپنے عقائد کی عمارت کھڑی کریں گے؟

ملک الموت کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ ہم نے اسے انسانی رُوحیں قبض کرنے پر مامور کیا ہے۔ اس پر زیادہ سے زیادہ جو تصور قائم کیا جاسکتا ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ یہ فرشتہ بیک وقت روئے زمین کے ہر حصے میں لاکھوں انسانوں کی رُوحیں قبض کرلیتا ہے۔ مگر کیا اس پر یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں اور سب کچھ دیکھ رہے ہیں؟ ان دونوں باتوں میں آخر کیا نسبت

ہے کہ ایک کو دوسری پہ قیاس کر لیا جائے ؟ اور پھر قیاس بھی ایسا کہ وہ عقیدہ قرار پائے اور ایمانیات میں داخل ہو اور لوگوں کو اس پہ ایمان لانے کی دعوت دی جائے اور نہ ماننے والوں کے ایمان میں نقص ثابت کیا جانے لگے ؟ یہ عقیدہ اگر واقعی اسلامی عقائد میں شامل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس کی تصریح فرماتا کہ میرے رسولؐ کو حاضر و ناظر تسلیم کرو ۔ حضورؐ خود یہ دعویٰ فرماتے اور اسے ماننے کی دعوت دیتے کہ میں ہر جگہ موجود ہوں اور قیامت تک حاضر و ناظر رہوں گا ۔ صحابہ کرام اور سلف صالحین میں یہ عقیدہ عام طور پہ شائع و ذائع ہوتا اور عقائد اسلام کی کتابوں میں اسے ثبت کیا جاتا ۔

آپ نے بعض حضرات کو مشرک کہنے یا نہ کہنے کا جو ذکر فرمایا ہے اس کے بارے میں میری رائے شاید آپ کو معلوم نہیں ہے ۔ میں ان مسائل میں ان کے خیالات کو تاویل کی غلطی سمجھتا ہوں، اور اسے غلط کہنے میں تامل نہیں کرتا ۔ مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ انہیں مشرک کہا جائے اور مشرکین عرب سے تشبیہ دی جائے ۔ میں ان کے بارے میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ شرک کو شرک جانتے ہوئے اس کے قائل ہو سکتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ توحید ہی کو اصل دین مانتے ہیں اور اسی پہ اعتقاد رکھتے ہیں ۔ اس لیے انہیں مشرک کہنا زیادتی ہے ۔ البتہ انہوں نے بعض آیات اور احادیث کی تاویل کرنے میں سخت غلطی کی ہے اور میں یہی امید رکھتا ہوں کہ اگر ضد دلانے والی باتیں نہ کی جائیں بلکہ معقول طریقے سے دلیل کے ساتھ سمجھایا جائے تو وہ جان بوجھ کر کسی گمراہی پہ اصرار نہ کریں ۔

(ترجمان القرآن ۔ مارچ ۱۹۶۲ء)

خواب میں زیارتِ نبویؐ

سوال :۔

براہ کرم مندرجہ ذیل سوال کے بارے میں اپنی تحقیق تحریر فرماکر تشفی فرمائیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو در حقیقت اس نے مجھے ہی دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری تمثال میں نہیں آسکتا او کما قال۔

اس حدیث کی صحیح تشریح کیا ہے ؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حسبِ شکل وشباہت میں بھی خواب میں دیکھا جائے تو یہ حضورؐ ہی کو خواب میں دیکھنا سمجھا جائے گا ؟ کیا حضورؐ کو یورپین لباس میں دیکھنا بھی آپ ہی کو دیکھنا سمجھا جائے گا ؟ اور کیا اس خواب کے زندگی پہ کچھ اثرات بھی پڑتے ہیں ؟

جواب :۔

اس حدیث کی صحیح تشریح یہ ہے کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضورؐ کی اصل شکل وصورت میں دیکھا اُس نے درحقیقت آپؐ ہی کو دیکھا۔ کیونکہ شیطان کو یہ قدرت نہیں دی گئی ہے کہ وہ آپؐ کی صورت میں آکر کسی کو بہکا سکے۔ اس کی یہی تشریح حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ نے کی ہے۔ امام بخاری کتاب التعبیر میں ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اذا راٰہ فی صورتہٖ (جب کہ دیکھنے والے

نے آپ کو آپ ہی کی صورت میں دیکھا ہو) علامہ ابن حجر سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ابن سیرین سے کہتا کہ میں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے تو وہ اس سے پوچھتے تھے کہ تو نے کس شکل میں دیکھا اگر وہ آپ کی کوئی ایسی شکل بیان کرتا جو آپ کے حلیہ سے نہ ملتی تھی تو ابن سیرینؒ کہہ دیتے تھے کہ تو نے حضورؐ کو نہیں دیکھا ہے۔ یہی طرزِ عمل حضرت ابن عباس کا بھی تھا جیسا کہ حاکم نے بسند نقل کیا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ خود حدیث کے الفاظ بھی اسی معنی کی توثیق کرتے ہیں۔ جن مختلف الفاظ میں یہ حدیث صحیح سندوں سے منقول ہوتی ہے ان سب کا مفہوم یہی ہے کہ "شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نہیں آسکتا" نہ یہ کہ شیطان کسی شکل میں آکر آدمی کو یہ دھوکہ نہیں دے سکتا کہ آنحضورؐ کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے اور آپ سے کوئی امر یا کوئی نہی کا حکم سُنے، یا دین کے معاملے میں کسی قسم کا ایماء آپ سے پائے تو اس کے لیے اس خواب کی پیروی اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ اس تعلیم یا ایماء کے مطابق کتاب وسنت ہونے کا اطمینان نہ کرلے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمارے لیے دین کا معاملہ خوابوں اور کشفوں اور الہاموں پر نہیں چھوڑا ہے۔ حق اور باطل اور صحیح اور غلط کو ایک روشن کتاب اور ایک مستند سنت میں پیش کر دیا گیا ہے جسے بیداری اور پورے شعور کی حالت میں دیکھ کر راہِ راست معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی خواب یا کشف یا الہام اس کتاب اور اس سنت کے مطابق ہے تو خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اللہ نے

حضورؐ کی زیارت نصیب کی، یا کشف والہام کی نعمت سے نوازا۔ لیکن اگر وہ اس کے خلاف ہے تو اسے رد کر دیجئے اور اللہ سے دعا مانگیے کہ وہ ایسی آزمائشوں سے آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔

ان دو باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بکثرت لوگ گمراہ ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔ متعدد آدمی میرے علم میں ایسے ہیں جو صرف اس بنا پہ ایک گمراہ مذہب کے پیرو ہو گئے کہ انہوں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مذہب کے بانی کی توثیق کرتے یا اس کی طرف التفات فرماتے دیکھا تھا۔ وہ اس گمراہی میں نہ پڑتے اگر اس حقیقت سے واقف ہوتے کہ خواب میں کسی شکل کے انسان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے دیکھ لینا درحقیقت حضورؐ کو دیکھنا نہیں ہے اور یہ کہ خواب میں واقعی حضورؐ ہی کی زیارت نصیب ہو تب بھی کوئی حکم شرعی اور امرِ دینی ایسے خواب سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر شیطان کے فریب سے تحفظ صرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ آدمی حضورؐ کو آپ کی اصلی شکل میں دیکھے تو اس کا فائدہ صرف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا تھا جنہوں نے آپ کو بیداری میں دیکھا تھا۔ بعد کے لوگ آخر کیسے جان سکتے ہیں کہ جو شکل وہ خواب میں دیکھ رہے ہیں وہ حضورؐ ہی کی ہے یا کسی اور کی؟ ان کو اس حدیث سے کیا تسلی ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کے لوگ اس بات کا اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ انہوں نے جو شکل خواب میں دیکھی وہ حضورؐ ہی کی شکل تھی، مگر یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ خواب کے معنی اور مضمون کی مطابقت قرآن و سنت کی تعلیم سے ہے یا نہیں۔ مطابقت پائی جاتی ہو تو پھر زیادہ

امکان اسی بات کا ہے کہ انہوں نے خواب میں حضورؐ ہی کی زیارت کی ہے، کیونکہ شیطان کسی کو راہِ راست دکھانے کے لیے تو بہروپ نہیں بھرا کرتا۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ ۱۳۷۵ھ جولائی ۱۹۵۶ء)

سحر کی حقیقت اور مُعَوِّذتین کی شانِ نزول

سوال:۔

معوذتین کی شانِ نزول کے متعلق بعض مفسرین نے حضور علیہ السلام پر یہودی لڑکیوں کے جادو کا اثر ہونا اور ان سورتوں کے پڑھنے سے اس کا زائل ہو جانا بحوالۂ احادیث تحریر فرمایا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟ نیز جادو کی حقیقت کیا ہے؟ بعض اشخاص حضور علیہ السلام پر جادو کے اثر کو منصبِ نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

جواب:۔

شانِ نزول کے بارے میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینے کی ہے کہ مفسرین جب کسی واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جب واقعہ پیش آیا اسی وقت وہ آیت نازل ہوئی تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے اس آیت کا تعلق ہے معوذتین کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ وہ مکے میں نازل ہوئی ہیں اور احادیث میں جادو کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ مدینہ طیبہ کا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بداہۃً غلط

ہے کہ جب جادو کا وہ واقعہ پیش آیا تو حضورؐ کو ان سورتوں کے پڑھنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

جادو کی حقیقت اگر آپ سمجھنا چاہیں تو قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ کا قصہ پڑھیں۔ جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں کے جو سانپ بنائے تھے وہ حقیقت میں سانپ نہیں بن گئے تھے، مگر اُس مجمع نے جو وہاں موجود تھا یہی محسوس کیا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰ کی آنکھیں پیغمبر ہونے کے باوجود اس قدر مسحور ہوگئیں کہ انہوں نے بھی انہیں سانپ ہی دیکھا۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ

(اعراف ۱۴۰)

جب جادوگروں نے اپنے انچھر پھینکے تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا اور انہیں مرعوب کر دیا۔

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ (طٰہٰ ۔ ۳)

پس یکایک ان کے جادو کی وجہ سے ان کی لاٹھیاں اور رسیاں موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جادو قلبِ ماہیت نہیں کرتا بلکہ ایک خاص قسم کا نفسیاتی اثر ڈال کر آدمی کے حواس کو متاثر کر دیتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ

جادو کی یہ تاثیر عام انسانوں پر ہی نہیں' انبیاء پر بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس ذریعہ سے کوئی جادوگر کسی نبی کو شکست نہیں دے سکتا' نہ اُس کے مشن کو فیل کر سکتا ہے' نہ اُسے اس حد تک متاثر کر سکتا ہے کہ وہ جادو کے زیرِ اثر آکر منصب نبوت کے خلاف کوئی کام کر جائے' لیکن بجائے خود یہ بات کہ ایک نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے' خود قرآن سے ثابت ہے۔

احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کی جو روایات آئی ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی عقل' تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہیں ہے' اور نہ قرآن کی بتائی ہوئی اس حقیقت کے خلاف ہے جس کی میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ نبی اگر زخمی یا شہید ہو سکتا ہے تو اُس کا جادو سے متاثر ہو جانا کونسی تعجب کی بات ہے! روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ چند روز تک حضورؐ کو کچھ نسیان سا لاحق ہو گیا تھا اور وہ بھی تمام معاملات میں نہیں بلکہ بعض معاملات میں جزوی طور پر۔

(ترجمان القرآن' رمضان' شوال ۱۳۷۱ھ ۔ جون' جولائی ۱۹۵۲ء)

گھر' گھوڑے اور عورت میں نحوست

سوال:۔

میں رہائش کے لیے ایک مکان خریدنا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا مکان فروخت ہو رہا ہے' جس کا مالک بالکل لاوارث فوت ہوا ہے اور دُور کے رشتہ

داروں کو وہ مکان میراث میں ملا ہے۔ میں نے اس مکان کے خریدنے کا ارادہ کیا تو میرے گھر کے بعض افراد مزاحم ہوئے اور کہنے لگے کہ گھر منحوس ہے، اس میں رہنے والوں کی نسل نہیں بڑھی حتیٰ کہ اصل مالک پہ خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ گھر کے لوگوں نے ان احادیث کا بھی حوالہ دیا۔ جن میں بعض گھروں، گھوڑوں اور عورتوں کے منحوس ہونے کا ذکر ہے۔ میں نے کتب احادیث میں اس سے متعلق روایتیں دیکھیں اور متعارف شروح و حواشی میں اس پہ جو لکھا گیا ہے وہ بھی پڑھا، لیکن جزم و یقین کے ساتھ کوئی متعین توجیہ سمجھ میں نہ آسکی۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:-

جن روایات کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ کتب حدیث میں وارد تو ہوئی ہیں۔ مگر حضرت عائشہ کی روایت سے ان کی حقیقت کچھ اور معلوم ہوتی ہے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں اس کو یوں نقل کیا ہے:

عن ابی حسان الاعرج ان رجلین دخلا علی عائشۃ فقالا ان ابا ھریرۃ یحدث ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول انما الطیرۃ فی المرأۃ والدابۃ والدار۔ فقالت والذی انزل القرآن علی ابی القاسم ما ھکذا کان یقول ولکن کان یقول کان اھل الجاھلیۃ یقول الطیرۃ فی المرأۃ والدابۃ والدار، ثم قرأت عائشۃ ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا۔

ابوحسان اعرج سے روایت ہے کہ دو آدمی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "بدشگونی تو صرف عورت اور گھوڑے گھر میں ہے"
اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس نے قرآن ابوالقاسم (یعنی آنحضرت صلعم) پر نازل کیا ہے، آپؐ یوں نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ آپؐ یہ کہا کرتے تھے کہ اہلِ جاہلیت، عورت، گھوڑے اور گھر میں نحوست و بدشگونی کے قائل تھے۔ پھر حضرت عائشہ نے یہ آیت پڑھی: کوئی مصیبت زمین میں اور تمہارے نفوس میں نہیں آتی مگر اس کے رونما ہونے سے پہلے وہ ایک نوشتے میں لکھی ہوتی ہے۔

ام المؤمنین کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جو روایت بیان کی ہے وہ غالباً صحیح الفاظ میں نقل نہیں ہوئی ہے۔ تاہم اگر اس کو درست مان بھی لیا جائے تو اس کی ایک معقول توجیہ بھی ہو سکتی ہے۔

نحوست کا ایک مفہوم تو وہم پرستانہ ہے جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ہے لیکن نحوست کا ایک دوسرا علمی مفہوم بھی ہے۔ اس سے مراد کسی چیز کا ناموافق اور ناسازگار ہونا ہے۔ یہ مفہوم معقول بھی ہے اور شریعت میں معتبر بھی۔ چنانچہ حدیث میں مکان کے منحوس ہونے کا جہاں ذکر ہے وہاں مطلب یہ نہیں ہے کہ مکان میں کوئی ایسی وہمی چیز موجود ہے جو رہنے والوں کی قسمت بگاڑ دیتی ہے بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ تجربے اور مشاہدے نے اس مکان کے لیے ناموافق ثابت کر دیا ہے۔ بسا اوقات کسی مرض کے متعدد مریض ایک مکان میں یکے بعد دیگرے

رہتے چلے آتے ہیں یہاں تک کہ مرض کے زہریلے اثرات وہاں مستقل طور پہ جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اب اگر تجربے سے یہ معلوم ہو جائے کہ جو وہاں رہا وہ اس مرض خاص میں مبتلا ہو گیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ مکان اب سکونت کے لیے ناموافق ہو گیا ہے خصوصیت کے ساتھ طاعون اور دق کے معاملے میں یہ بات بارہا تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔ احادیث میں بھی یہ حکم موجود ہے کہ جہاں طاعون پھیلا ہوا ہو وہاں سے بھاگو بھی نہیں اور قصداً وہاں جاؤ بھی نہیں۔ ایسا ہی معاملہ عورت اور گھوڑے کا ہے اگر متعدد آدمیوں کو ایک گھوڑے کی سواری ناموافق آئی ہو، یا متعدد آدمی ایک عورت سے یکے بعد دیگرے نکاح کر کے خاص مرض کے شکار ہوئے ہوں تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس گھوڑے یا اس عورت میں کوئی نامعلوم خرابی ہے۔

اب یہ دیکھنا آپ کا کام ہے کہ جس مکان کو آپ خریدنا چاہتے ہیں اس کی نحوست وہمی نوعیت کی ہے یا تجربی نوعیت کی۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ۔ جنوری ۱۹۵۳ء)

شفاعت کا صحیح تصور

سوال :

کسی مولوی صاحب نے ایک اشتہار شائع کیا ہے جس میں آپ پہ معتزلی اور خارجی ہونے کا فتویٰ لگایا ہے۔ بنائے فتویٰ یہ ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قیامت کے روز امت کے بارے میں شفاعت کے

منکر ہیں۔ اس کا حوالہ ترجمان القرآن جلد ۲۴ عدد ۱، ۲ صفحہ ۳۱ سے لیتے ہوئے آیت " جنگ کرو اہل کتاب میں ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے " کے تشریحی نوٹ کا دیا ہے۔ یہ نوٹ یوں ہے:
" وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ اور کسی بزرگ سے منتسب ہونا کام نہ آئے گا " اسی طرح تفہیمات سے بھی کوئی حوالہ اسی قسم کا اخذ کیا ہے۔

براہ کرم آپ بیان فرمائیں کہ اہل سنت کا عقیدہ شفاعت کے بارے میں کیا ہے۔ نبی صلعم اپنی امت کی شفاعت کس حیثیت سے کریں گے، نیز آیا وہ ساری امت کی طرف سے شفیع ہوں گے؟

جواب :-

خدا ان لوگوں کو نیک ہدایت دے جو دوسروں کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے دنیا میں پھیلاتے ہیں اور ان کے اقوال کو ایسے معنی پہناتے ہیں جو قائل کے منشاء کے خلاف ہوں۔ اگر الزام لگانے والے بزرگ کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہوتا تو وہ اشتہار کی اشاعت سے پہلے مجھ سے لکھ کر پوچھ سکتے تھے کہ تیری ان عبارات کا منشا کیا ہے، اور شفاعت کے بارے میں تیرا عقیدہ کیا ہے۔ میری جن عبارتوں کا انہوں نے حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک یہود و نصاریٰ کے غلط عقیدۂ شفاعت کی تردید میں ہے۔ اور اس کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس غلط عقیدے کی وجہ سے کس طرح اہل کتاب کا ایمان بالیوم الآخر باطل ہو گیا ہے جس کی بنا پر قرآن میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری عبارت میں ان تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنی دعوتِ رسالت کے آغاز میں مشرکینِ مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمائی تھیں دونوں میں سے کسی مقام پر بھی اسلام کے عقیدۂ شفاعت کو بیان کرنے کا موقع نہ تھا۔ آخر کافروں اور مشرکوں کے سلسلے میں اُس شفاعت کا ذکر کیوں کیا جاتا جس کے مستحق صرف اہلِ ایمان ہیں؟ کافروں اور مشرکوں کے معاملے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ وہی کچھ ہے جو قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:"

اِتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۔

رہا اسلامی عقیدۂ شفاعت تو وہ قرآن و حدیث کی رُو سے یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت صرف وہ کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے، اور صرف اُسی شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے اللہ اجازت دے۔ ملاحظہ ہو:

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهُ قَوْلًا ۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۔

اس قاعدے کے تحت نبی صلعم آخرت میں یقیناً شفاعت فرمائیں گے، مگر یہ شفاعت اللہ کے اذن سے ہوگی اور اُن اہلِ ایمان کے حق میں ہوگی جو اپنی حدِ وسع کے نیک عمل کرنے کی کوشش کے باوجود گناہوں میں آلودہ ہو گئے ہوں۔ جان بوجھ کر خیانتیں اور بدکاریاں کرنے والے، اور کبھی خدا سے نہ ڈرنے والے لوگ حضورؐ کی شفاعت کے مستحق نہیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کا ایک طویل

خطبہ مروی ہے جس میں آپ جرمِ خیانت کی شدت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز یہ خائن لوگ اس حالت میں آئیں گے کہ ان کی گردن پر ان کا خیانت سے حاصل کیا ہوا مال لدا ہوگا اور وہ مجھے پکاریں گے کہ یارسول اللہؐ اغثنی! (یارسول اللہ! میری مدد فرمایئے) مگر میں جواب دوں گا کہ لا املك لك شیئا، قد ابلغتك (میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا، میں نے تجھ تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا)۔ ملاحظہ ہو:۔ مشکوٰۃ باب قسمۃ الغنائم، الغلول فیہا)

(ترجمان القرآن، محرم ۱۳۷۰ھ۔ نومبر ۱۹۵۰ء)

عبادات اور فقہی مسائل

اذان اور نماز کی دعاؤں کے متعلق چند شبہات

سوال :-

ایک دن میں صبح کی اذان سن رہا تھا کہ ذہن میں عجیب وغریب سوالات ابھرنے لگے اور شکوک وشبہات کا ایک طوفان دل میں برپا ہوگیا ـــــــ اذان سے ذہن نماز کی طرف منتقل ہوا اور جب سوچنا شروع کیا تو نماز کی عجیب صورت سامنے آئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز کس طرح پڑھوں اور کیا پڑھوں ؟ ....

ایک مسلمان کو ماں کی گود ہی میں جو اوّلیں درس ملتا ہے وہ یہ ہے۔ "اللہ ہی عبادت کے لائق ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں" ـــــــ پھر

(۱) اذان بلاوا ہے خالصتہً اللہ کی عبادت کے لیے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، تو اشھد ان لا الہ الا اللہ کے ساتھ ہی اشھد ان محمد رسول اللہ کے کیا معنی ؟

(۲) نماز میں سورۂ فاتحہ، اخلاص یا کوئی اور سورہ جو ہم پڑھتے ہیں ان میں صرف اللہ ہی کی حمد و ثنا اور عظمت و بزرگی کا بیان ہے۔ اسی طرح رکوع و سجود میں اُسی کی تسبیح و تہلیل بیان ہوتی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہم تشہد کے لیے بیٹھتے ہیں تو حضور سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ تشہد اور دونوں درود شریف وغیرہ۔ کیا اس طرح حضورؐ کی عبادت میں شریک نہیں ہو جاتے؟

(۳) دونوں درود شریف جو ہم پڑھتے ہیں ظاہر ہے کہ حضورؐ اس طرح نہیں پڑھتے ہوں گے۔ کیونکہ ہم تو پڑھتے ہیں اللّٰھم صل علی محمد وعلیٰ اٰل محمد (اے اللہ رحمت فرما محمد پر اور محمد کی آل پر)۔ یہ دونوں درود شریف درحقیقت دعائیں ہیں اور اسی طرح اور دعا رَبِّ اجْعَلْنِی بھی۔ عبادت نام دعاؤں کا نہیں بلکہ اُس خالقِ ارض و سما کی حمد و ثنا بیان کرنے کا نام ہے تو کیا یہ زیادہ مناسب نہیں کہ عبادت کے اختتام پر دعائیں مانگی جائیں، بہ نسبت اس کے کہ عین عبادت میں دعائیں مانگی شروع کر دی جائیں؟ میرا خیال ہے کہ حضورؐ خود تشہد اور درود شریف وغیرہ نہیں پڑھتے ہوں گے کیونکہ آپ سے یہ بعید ہے کہ عین نماز میں آپ اپنے لیے مانگنے لگے۔ پھر ذرا تشہد پہ غور فرمایئے۔ ظاہر ہے کہ درود کی طرح اگر حضورؐ تشہد بھی پڑھتے تھے تو وہ بھی الگ ہوگا۔ کیونکہ "اے نبی! تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں" کی جگہ آپ پڑھتے ہوں گے "مجھ پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی

برکتیں نازل ہوں "

(۴) اللہ کی جو عبادت ہم بجا لاتے ہیں اس کا نام الصلوٰۃ یعنی نماز ہے پھر یہ فرض، سنّت، وتر، نفل کیا چیزیں ہیں اور یہ پڑھ کر ہم کس کی عبادت کرتے ہیں۔ جاتے تو ہم ہیں اللہ کی عبادت بجا لانے اور پڑھنے لگتے ہیں نماز سنت۔ جس کی نیت بھی یوں باندھتے ہیں، دو رکعت نماز سنّت سنّت رسول اللہ کی وغیرہ وغیرہ۔ کیا اس طرح بھی حضورؐ کا اللہ کی عبادت میں شریک ہو جانا ثابت نہیں ہوتا؟

(۵) نماز کے آخر میں جو سلام ہم پھیرتے ہیں اس کا مخاطب کون ہے؟

(۶) کیا حضورؐ بھی روزانہ پانچ نمازیں بجا لاتے تھے؟ اور اتنی ہی رکعتیں پڑھتے ہیں؟ اس سوال کی قدرے میں نے تحقیق کی لیکن کوئی مستند حوالہ فی الحال ایسا نہیں ملا کہ اس سوال کا جواب ہوتا۔ بخلاف اس کے بخاری شریف میں یہ حدیث نظر آئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کی دو دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی طرح مؤطا کتاب الصلوٰۃ میں یہ لکھا دیکھا کہ رات دن کی نماز دو دو رکعت ہے۔ یہ دونوں حدیثیں دو دو رکعت نماز ثابت کرتی ہیں۔

ان خیالات و شکوک نے ذہن کو پراگندہ کر رکھا ہے اور اکثر مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ ہماری موجودہ نماز وہ نہیں ہے جو آنحضرتؐ نے بتائی ہو گی۔ خدارا میری الجھن کو دور فرمایئے اور مجھے

گمراہ ہونے سے بچائیے ۔ مجھے نماز چھوٹ جانے کا خطرہ ہے ۔

جواب :-

آپ کے دل میں اگر وساوِس پیدا ہوا کریں تو ان کی وجہ سے نماز ترک نہ کر دیا کریں ۔ بلکہ نماز پڑھتے رہیں اور اپنے وساوس کے متعلق کسی جاننے والے سے پوچھ کر اپنا اطمینان کر لیا کریں ۔

جو سوالات آپ نے کیے ہیں اُن کے جوابات یہ ہیں :

(۱) اذان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی شہادت دی جاتی ہے نہ کہ خدا ہونے کی ۔ پھر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا کہ رسالت کی شہادت دینے سے عبادت میں شرک واقع ہو جائے گا ؟ رسالت کی شہادت تو اس لیے دی جاتی ہے کہ ہم خدا کی عبادت اُس عقیدے اور طریقے کے مطابق کر رہے ہیں جو رسول اللہؐ نے ہمیں سکھایا ہے ۔ ہم نے خود اپنی فکر سے یہ طریقہ اور عقیدہ ایجاد نہیں کر لیا ہے ۔

(۲) تشہد کی پوری عبارت پر آپ غور کریں ۔ پہلے آپ اللہ تعالےٰ کے حضور اپنا سلام پیش کرتے ہیں ۔ پھر رسولؐ کے لیے رحمت و برکت کی دُعا کرتے ہیں ۔ پھر اپنے حق میں اور تمام نیک بندوں کے حق میں سلامتی کی دعا کرتے ہیں ۔ پھر اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتے ہیں ۔ جو دراصل اللہ تعالیٰ ہی سے اس اَمر کی دُعا ہے کہ وہ حضورؐ پر اپنی نوازشات کی بارش فرمائے ۔ پھر اللہ سے اپنے حق میں اور اپنے والدین کے حق میں بخشش کی دعا کرتے ہیں ۔ ان سارے مضامین کو آپ خود دیکھیں ۔ ان میں کیا چیز ہے

جسے آپ شرک کہہ سکتے ہیں ؟ یہ تو ساری دعائیں اللہ تعالیٰ ہی سے ہیں۔ کیا اللہ سے دعا کرنا شرک ہے ؟ اور کیا اللہ کے رسول کو رسول ماننا بھی شرک ہے ؟

(۳) یہ غلط فہمی آپ کو کہاں سے ہوگئی کہ عبادت صرف اللہ کی حمد و ثنا کرنے کا نام ہے اور اللہ سے دعا کرنا عبادت نہیں ہے۔ دعا تو روحِ عبادت ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ان مشرکین کو جو غیر اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں، غیر اللہ کی عبادت کرنے والا قرار دیا ہے، حتیٰ کہ اکثر مقامات پر یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کہنے کے بجائے یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ اللہ ہی سے دعا مانگو۔

یہ تشہد جو ہم پڑھتے ہیں، یہ حضورؐ نے صحابہ کو سکھایا تھا اور انہیں ہدایت فرمائی تھی کہ تم یہ پڑھا کرو، اس لیے ہم کو نماز میں یہی پڑھنا چاہیئے۔ رہا حضورؐ کا اپنا تشہد، تو اس کے متعلق احادیث میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ حضورؐ خود کیا پڑھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کے تشہد میں الفاظ مختلف ہوتے ہوں۔ اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ حضورؐ خود بھی یہی تشہد پڑھتے ہوں۔ اگر ہم نماز میں اپنے لیے دعا کرتے ہیں تو آخر آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے کہ حضورؐ بھی نماز میں اپنے لیے دعا فرماتے ہوں ؟ اسی طرح اگر ہم حضورؐ کے نبی ہونے کی شہادت نماز میں دیتے ہیں تو اس میں آخر کیا خرابی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی نبوت کی شہادت دیتے ہوں ؟

(۴) فرض نماز کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو اس کے عائد کردہ فریضۂ صلوٰۃ کو ادا کرنے کے لیے کم سے کم لازم ہے۔ جس کے بغیر حکم کی تعمیل

سے ہم قاصر رہ جائیں گے۔ سنّت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو فرض کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ادا کیا کرتے تھے اور جس کی آپ نے ہمیں تاکید کی ہے۔ نفل سے مراد ہے خدا کی وہ عبادت جو ہم اپنی خوشی سے کرتے جسے ہم پہ نہ لازم کیا گیا ہے اور نہ جس کی تاکید کی گئی ہے۔ اب فرمایئے کہ اس میں شرک کہاں سے آگیا؟ "سنت رسول اللہ کی" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ رسول اللہؐ کی نماز پڑھی جا رہی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض سے زائد پڑھا کرتے تھے اور آپؐ کے اتباع میں ہم بھی پڑھتے ہیں۔

(۵) کسی عمل کو ختم کرنے کے لیے آخر اس کی کوئی صورت ہونی چاہیئے۔ نماز ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ جو قبلہ رُو بیٹھ کر عبادت کر رہے تھے، اب دونوں طرف منہ پھیر کر اس عمل کو ختم کر دیں۔ اب منہ پھیرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ چپکے سے منہ پھیر دیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ آپ خدا سے تمام خلق کے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہوئے منہ پھیریں۔ آپ کو ان میں سے کون سی صورت پسند ہے؟

(۶) جن احادیث کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ ابتدائی دور کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل جب کہ نماز کے احکام تدریجاً مکمل ہو چکے تھے یہی تھا کہ آپؐ پانچوں وقت وہی رکعتیں پڑھتے تھے جو اب تمام مسلمانوں میں رائج ہیں۔ یہ چیز دوسری متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ حضرت عمرؓ کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے وہ نوافل سے متعلق ہے۔

(ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۶۱ء)

اجنبی ماحول میں تبلیغِ اسلام

سوال :-

میں علی گڑھ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہوں اور آج کل نائجیریا میں بحیثیت سائنس ٹیچر کام کر رہا ہوں۔ جب میں ہندوستان سے یہاں آ رہا تھا اس وقت خیال تھا کہ میں ایک مسلم اکثریت کے علاقہ میں جا رہا ہوں اس لیے شرعی احکام کی پابندی میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ لیکن یہاں آکر دیکھا تو معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ جس علاقے میں میرا قیام ہے یہ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں عیسائی مشنریز خوب کام کر رہے ہیں۔ بہت سے اسکول اور ہسپتال ان کے ذریعے سے چل رہے ہیں۔ مسلمان یہاں پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ بھی تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ انگریزی نہیں بول سکتے حالانکہ ہر ایک عیسائی تھوڑی بہت انگریزی بول سکتا ہے پڑھے لکھے لوگوں کی بہت مانگ ہے۔ یہاں پر بہت سے غیر ملکی ٹیچر اور سوداگر کام کر رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر عیسائی اور ہندو ہیں۔ میں اپنی طرز کا اکیلا ہوں۔ میرے شہر میں تین بہت چھوٹی مسجدیں ہیں۔ وہ بہت ہی شکستہ حالت میں ہیں۔ اس کے علاوہ دور دور کہیں اذان کی آواز بھی نہیں آتی۔ یہ ملک اکتوبر میں آزاد ہونے والا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلم کلچر کے مقابلہ میں مغربی اور عیسائی کلچر بہت نمایاں ہے۔ شراب کا استعمال شاید مغربی ممالک سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن ان سب کے

باوجود دو باتیں یہاں خاص طور پہ دیکھنے میں آئیں۔ ایک انسانی رواداری اس معاملے میں یہ لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ غیر ملکی خیر مقدم کرتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جو مسلمان یہاں ہیں ان کے اوپر مغربی طرزِ فکر کا اتنا اثر نہیں ہوا جتنا کہ ہمارے ہاں ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ لوگ اب تک مغربی تعلیم کا بائیکاٹ کرتے رہے ہیں۔

ان حالات میں آپ مشورہ دیجئے کہ کس طرح اسلام کی صحیح نمائندگی کی جائے اور یہاں کے لوگوں کو انگریزی میں کونسا لٹریچر دیا جائے۔ پڑھا لکھا طبقہ انگریزی لٹریچر سمجھ سکتا ہے۔ "پردہ" کی طرح اگر کوئی کتاب شراب نوشی پہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہو تو اس سے بھی مطلع فرمایئے!

دوسرے یہ بھی آپ سے مشورہ چاہتا ہوں کہ ایسے حالات میں کس طرح انسان صحیح راہ پہ قائم رہے جبکہ ماحول اور سوسائٹی دوسرے رنگ میں رنگے ہوں۔

ذیل حسب ذیل چیزوں پہ اگر روشنی ڈالیں تو آپ کا مشکور ہوں گا۔

۱۔ یہاں پہ دعوتوں اور پارٹیوں میں شراب کا استعمال عام طور پہ ہوتا ہے ایسی صورت میں ان دعوتوں میں شرکت کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اب تک میرا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ ایسی جگہوں پہ ضرور شرکت کرتا ہوں اور شراب اور دوسری اس قسم کی چیزوں سے انکار کر دیتا ہوں تاکہ کم از کم ان کو یہ احساس ہو جائے کہ بعض لوگوں کو ہماری یہ مرغوب غذا ناپسند ہے۔

۲۔ ان کے برتنوں میں کھانا اور پینا درست ہے یا نہیں؟

۳۔ بہت سی چیزیں ہیں جن میں الکوہل کی تھوڑی بہت آمیزش ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔ ان کا استعمال جائز ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

۴۔ اگر کوئی دعوت کچھ لوگوں کو یہاں دی جائے تو اس میں شراب دی جا سکتی ہے یا نہیں ؟ کیونکہ یہاں کے لوگ بغیر شراب کے دعوت ہی نہیں سمجھتے اور اگر اس کا استعمال نہ کیا جائے تو اس کا کیا بدل دیا جائے ؟

جواب :۔

خوشی ہوئی کہ آپ کو ملک سے باہر ایک ایسی جگہ کام کرنے کا موقع ملا ہے جہاں آپ اسلام کی بہت کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنی جگہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ پسماندہ مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کے سامنے حقیقی اسلام کی نمائندگی کے لیے مامور ہیں، اور اپنے قول یا عمل سے اگر آپ نے ذرا بھی غلط نمائندگی کی تو بہت سے بندگانِ خدا کی گمراہی کا وبال آپ کے اوپر ہوگا۔ اس احساس کے ساتھ اگر آپ وہاں رہیں گے اور حدِ استطاعت تک اسلام کو ٹھیک سمجھ کر ایک مسلمان کی زندگی کا نمونہ بننے کی کوشش کرتے رہیں گے تو امید ہے کہ یہ آپ کی اپنی ترقی کے لیے بھی مفید ہوگا اور کیا عجب کہ یہی چیز آپ کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کی ہدایت کا سبب بھی بن جائے جس کا اجر آپ کو خدا کے ہاں نصیب ہو۔

وہاں کے جو حالات مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوئے ہیں ان پر غور کرنے کے بعد میرے نزدیک کام کی جو صورتیں مناسب ہیں میں عرض کیے دیتا ہوں۔

مقامی زبان سیکھنے اور بولنے کی مشق کریں اور صرف انگریزی پر اکتفا نہ کریں۔ غیر ممالک میں جب باہر کا کوئی شخص مقامی لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں بات کرتا

سے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور اس کی بات بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔

مقامی مسلمانوں کے ساتھ ربط ضبط بڑھائیے۔ ان کو صحیح دین سمجھانے اور اسلامی طور طریقے سکھانے کی کوشش کیجئے۔ ان میں سے جن کے بچے آپ کے مدرسے میں پڑھتے ہوں ان پر خاص توجہ کیجئے۔ تاکہ وہ آپ کو اپنا ہمدرد سمجھیں دوسرے مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کو بھی اگر آپ ان کی تعلیم میں کچھ مدد دے سکتے ہوں تو ضرور دیجئے۔ جو لوگ آپ سے انگریزی پڑھنا چاہتے ہوں انہیں پڑھائیے۔ اس طرح ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ پیدا کیجئے اور پھر ان کے اندر دین کا صحیح علم و عمل پھیلانے اور ان کے حالات درست کرنے کی سبیل نکالیے ان میں اگر کچھ باا ثر آدمیوں سے تعلقات ہو جائیں تو انہیں مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کے طریقے بتائیے اور اخلاص و حکمت کے ساتھ کام کرنے پر ابھاریئے بے غرضی، محبت، تواضع اور حقیقی خیر خواہی کے ساتھ جب آپ ان کی بھلائی کے لیے کوشاں ہوں گے تو دیر یا سویر، انشاء اللہ ایک دن آپ ان کے دل اپنی مٹھی میں لے لیں گے اور وہ آپ کے کہے پر چلنے لگیں گے۔

جس مدرسے میں آپ کام کرتے ہیں وہاں اپنے طرزِ عمل سے اپنی اہلیت، فرض شناسی اور بلند اخلاقی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کیجئے، یہاں تک کہ طلبہ اور اساتذہ اور منتظمین سب پر آپ کا اخلاقی اثر قائم ہو جائے۔ پھر وہ راستے تلاش کیجئے، جن سے آپ غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ میں اپنے خیالات پھیلا سکیں۔ اس معاملہ میں غایت درجہ تدبر و دانائی کی ضرورت ہے۔ جو موقع بھی اسلام کی نمائندگی کا ملے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ لیکن ایک قدم بھی غلط نہ اٹھائیے ورنہ نتائج الٹے برآمد

ہوں گے۔ طبیب کی دانائی اسی میں ہے کہ وہ مریض کو ٹھیک دوا کی خوراک بروقت دے، نہ کم خوراک دے اور نہ زیادہ دے بیٹھے۔

عام لوگ جن سے آپ کا میل جول ہو ان سے اپنی گفتگوؤں میں مناسب طریقے پر اسلام کا تعارف کرائیے۔ مغربی تہذیب کی کمزوریاں ان پہ واضح کیجئے۔ عیسائیت کی ناکامی اس حد تک انہیں سمجھائیے جس کے سننے کا ان میں تحمل ہو۔ پھر جن لوگوں میں اسلامی لٹریچر دیکھنے کی خواہش آپ پائیں ان کو موزوں لٹریچر پڑھنے کے لیے دیجیے۔ مانگ پیدا کیے بغیر ہر ایک کو لٹریچر دینا شروع نہ کر دیجئے۔ انگریزی لٹریچر کی فہرست آپ کو یہاں سے بھجوا دی جائے گی اسے منگوا کر اپنے پاس رکھ لیں۔

غیر مسلموں میں سے جن کے اندر آپ خاص صلاحیت، سلامت طبع اور حق پسندی محسوس کریں ان سے ذاتی تعلقات بھی بڑھائیے اور ان پر خصوصیت کے ساتھ کام بھی کیجئے تاکہ اللہ انہیں ہدایت نصیب کرے۔ لیکن اپنے ہاتھ پر کسی کو مشرف باسلام کرنے سے پرہیز کیجئے۔ جو شخص بھی مسلمان ہونا چاہے اسے مقامی مسلمانوں کے پاس بھیجئے۔

شراب نوشی کے خلاف انگریزی میں بہت سا لٹریچر موجود ہے۔ آپ (Church of England Temperance Society) سے لندن کے پتہ پر اور (Anti Saloon League of America) سے واشنگٹن کے پتے پہ مراسلت کر کے اس موضوع کے متعلق لٹریچر کی فہرستیں منگوالیں اور مناسب کتابوں کا انتخاب کر لیں۔

اب مختصر طور پر آپ کے سوالات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

۱۔ دوسروں کی طرف سے اگر آپ کو دعوت دی جائے تو اس میں ضرور

شرکت کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر آپ ان کی اصلاح کے لیے اُن سے گھُل مل نہ سکیں گے۔ اس نیت کے ساتھ اگر آپ ایسی محفلوں میں شریک ہوں جہاں لوگ شراب پیتے ہوں تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں مؤاخذہ نہ ہوگا۔ آپ ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر علانیہ نہ صرف یہ کہ شراب پینے سے پرہیز کریں بلکہ کھلم کھلا اس پرہیز کے معقول وجوہ ہر پوچھنے والے کو ایسے طریقے سے سمجھائیں کہ اسے ناگوار خاطر نہ ہو۔ شرابیوں کی محفل میں ان لوگوں کی شرکت تو بلاشبہ مضر ہے جو شراب نہ پینے پر شرماتے ہوں، لیکن اُن لوگوں کی شرکت بہت مفید ہے جو دھڑلّے کے ساتھ شراب نوشی سے انکار کریں اور دلیل کی طاقت سے شراب پینے کی برائی وہیں اسی محفل میں ان لوگوں کو سمجھانے پر آمادہ ہو جائیں جو ان سے شراب نہ پینے کے وجوہ دریافت کریں۔ یہ تو بہترین تبلیغ ہے جس پر میں خدا سے اجر کی توقع رکھتا ہوں۔

۲۔ ان کے صاف دُھلے ہوئے برتنوں میں آپ کھانا کھا سکتے ہیں اگر آپ کو اطمینان ہو کہ وہ کسی حرام چیز سے ملوث نہیں ہیں۔ اطمینان نہ ہونے کی صورت میں بہتر یہ ہے کہ آپ دعوت وصول ہوتے ہی اپنی اوّلین فرصت میں داعی کو اپنے اصول اور مسلک سے آگاہ فرما دیں اور ان کو لکھ بھیجیں کہ آپ کے ساتھ دعوت میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

۳۔ جن چیزوں میں الکوہل کی آمیزش ہو ان کا استعمال اس وقت تک نہ کرنا چاہیے جب تک کوئی طبیب آپ کی جان بچانے کے لیے یا آپ کی صحت کو غیر معمولی نقصان سے بچانے کے لیے اس کا استعمال ناگزیر نہ بتائے۔

۴۔ آپ خود جن لوگوں کو مدعو کریں ان کو ہرگز شراب نہ پلائیں۔ دعوت دینے سے پہلے آپ کو انہیں آگاہ کر دینا چاہیئے کہ آپ دعوت میں اپنے اصول کے خلاف کسی کو شراب نہیں پیش کر سکتے۔ اس شرط پر جو لوگ آپ کی دعوت قبول کریں صرف انہی کو مدعو کیجئے۔ شراب کا بدل پیش کرنا ہو تو پاکستان یا ہندوستان سے شربت روح افزا یا ایسی ہی کوئی اور خوش رنگ و معطر شروب منگوا لیجئے۔ امید ہے کہ وہ ان لوگوں کو بہت پسند آئے گا۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۴، عدد ۱۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

کیا روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود فدیہ دیا جا سکتا ہے؟

سوال:۔

یہاں کیمل پور میں ایک صاحب علم نے پچھلے ماہ رمضان میں ایک فتنہ کھڑا کیا تھا کہ رمضان کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیات بیک وقت نازل ہوئی تھیں اس لیے اللہ نے شروع میں جو رعایت دی ہے کہ "جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں، اور پھر نہ رکھیں، تو وہ فدیہ ادا کریں" یہ ایک اٹل رعایت ہے اور اب بھی اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کی حمایت میں ایک آیت ۱۸۴ کے آخری حصہ کو پیش کیا گیا کہ اگر روزہ رکھو تو بہتر ہے اور نہ رکھو تو فدیہ ادا کرو۔ ان کا کہنا تھا کہ آیت ۱۸۴ پہلی آیات کے ساتھ ہی نازل ہوئی تھی وہ پہلی آیات کی رعایت

کو کیسے چھین سکتی ہے۔

آپ کی تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آیات ۱۸۲ و ۱۸۳ تو جنگ بدر سے پہلے ۲ھ میں نازل ہوئیں اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو پھر ان کے اس خیال کی تردید ہو سکتی ہے کہ آج بھی ایک تندرست ہٹا کٹا انسان فدیہ دے کر روزے کی فرضیت سے بچ سکتا ہے۔

مذکورہ بالا صاحب اپنے آپ کو علم حدیث کے استاد اور قرآن کے مفسر سمجھتے ہیں۔ اور پرویز کے متعلق اپنے افکار و خیالات دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ آپ براہ مہربانی کچھ تکلیف گوارا کر کے ان کتب کا حوالہ دے دیں جن سے آپ کو ثبوت ملا ہو کہ آیات ۱۸۲ اور ۱۸۳ تو ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئیں اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی۔ اس طرح ہمارے پاس ایک سند ہو جائے گی اور ہم انہیں اپنے فاسد خیالات کی نشر و اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ اسلام کی ہی خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ ضرور ہمیں اپنے افکار عالیہ سے مستفید فرمائیں گے۔

جواب :-

اس سوال میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے اس کا منشا تو خود اس کے موضوع و مضمون ہی سے ظاہر ہے۔ اس کے مصنف کا صاف مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں روزے رکھنے کی "مصیبت" سے خود بھی بچیں اور ا-

ہم مشرب "صاحب لوگوں" کو بھی بچا ئیں۔ عام فساق غنیمت ہیں کہ کھلی کھلی نافرمانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور جو نافرمانی کرنا چاہتے ہیں اسے بے محابا کر گزرتے ہیں۔ ان میں کم از کم یہ مکاری موجود نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی کرنے کے لیے خود خدا ہی کی کتاب کو حجت بنائیں۔ لیکن نرالی قسم کے فساق وہ ہیں کہ اپنے فسق و فجور کے لیے قرآن کو آڑ بناتے ہیں، اور قرآن سے یہ خدمت لینے ہی کے لیے انہوں نے اس کا رشتہ حدیث سے توڑا ہے تاکہ اس کی آیات کو جیسے چاہیں معنی پہنائیں، ان لوگوں کو آج کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ جس جس طرح چاہتے ہیں خلقِ خدا کو خدا کی کتاب کا نام لے کر خدا کے دین سے پھیرتے ہیں۔ پہلے انہوں نے "دو قرآن" تصنیف کیے تھے۔ پھر "دو اسلام" وضع کیے۔ آگے چل کر یہ "دو خدا" بھی بنا ڈالیں تو کون ان کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔

روزوں کے بارے میں قرآن سے جو غلط استدلال انہوں نے کیا ہے اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ زیر بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، لکھ دیئے گئے تم پر روزے جس طرح لکھے گئے تھے تم سے پہلے کے لوگوں پر، تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا، پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو، یا سفر پر ہو، تو پورا ہونا چاہیئے شمار دوسرے دنوں سے۔ اور جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضا کارانہ بجا لائے نیکی تو وہ بہتر ہے اسی کے لیے اور یہ کہ تم روزہ رکھو

یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر علم رکھتے ہو۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بنا کر انسانوں کے لیے، اور روشن آیات لیے ہوئے ہدایت اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پائے تم میں سے اس مہینے کو تو چاہیئے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مریض ہو یا سفر پہ ہو تو پورا ہونا چاہیئے شمار دوسرے دنوں سے۔"

(ملاحظہ فرمائیے سورۂ البقرہ رکوع ۲۳۔ اور اصل سے مقابلہ کر کے خوب اطمینان کر لیجئے کہ اصل اور ترجمے میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق تو نہیں ہے)

اس عبارت کو جو شخص خالی الذہن ہو کر پڑھے گا۔ اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلۂ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی۔ تو اس میں پہلے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہِ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لیے تم میں سے جو اس کو پائے اسے چاہیئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے! آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے کہ پہلے کہا "روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا" پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کیے، پھر بتایا گیا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں اور رمضان کو اس کام کے لیے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ ایک مربوط سلسلۂ تقریر میں شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا، بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کیے گئے ہیں اور چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اس لیے یہ فرض روزے تم

اس مہینے میں رکھو ۔ اس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا ۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہوگا کہ اس سلسلۂ عبارت میں جب پہلے فقرہ آچکا تھا کہ "جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پہ ہو تو پورا ہونا چاہیئے شمار دوسرے دنوں سے" تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دُہرانے کی کیا حاجت تھی ؟ اور اگر فی الواقع اس کا دُہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دُہرایا گیا کہ "جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا ؟" حقیقت میں ضرورت تو دونوں میں سے ایک کو بھی دُہرانے کی نہ تھی ۔ لیکن ایک کو دُہرانا اور دوسرے کو نہ دُہرانا تو ایک معما سا محسوس ہوتا ہے ۔

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ " ماہِ رمضان وہ ہے" سے پہلے کی عبارت اور اس کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے صریحاً متناقض نظر آتا ہے ۔ پہلا مضمون صاف طور پہ یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے ، لیکن اگر وہ روزہ ہی رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے ۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے ، اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اس رعایت کا تو اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی ، مگر اس رعایت کو ساقط کر دیا گیا جو اوپر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی ۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک

ہی معاملے میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے گا۔ پھر بھلا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان کیسے ہو سکتا ہے؟

پہلے دو سوالات صرف سوالات ہی ہیں۔ لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لیے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے۔ جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں، اور حدیث کو احکامِ دین کا ماخذ اور قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

اب دیکھیے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآن مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے، ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو "اے لوگو" سے شروع ہو کر "اگر تم علم رکھتے ہو" پر ختم ہوتا ہے، ابتداءً نازل ہوا تھا، اور دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا۔ البتہ مسافر اور مریض کے لیے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔

اس بیان میں نہ صرف یہ کہ سارے اشکالات رفع ہو گئے، بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی ہے۔ اب بات سمجھ میں آگئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس نعمت

کے شکریے میں تم کو اس مہینے کے روزے ضرور رکھنے چاہئیں۔

محدثین و مفسرین نے یہ تشریح متعدد صحابہ اور تابعین سے نقل کی ہے۔ مثلاً امام احمد بن حنبل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک طویل تشریحی بیان نقل کرتے ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نماز اور روزہ، دونوں کی موجودہ صورت بتدریج قائم کی گئی ہے۔ نماز میں پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کیا جاتا تھا۔ پھر کعبے کی طرف رُخ پھیرا گیا۔ پہلے لوگ ایک دوسرے کو نماز کے وقت اطلاع دیتے تھے پھر اذان کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ اگر ایک شخص بیچ کے کسی مرحلے پہ آکر جماعت میں شریک ہوتا تھا تو اپنی نماز کا چھوٹا ہوا حصّہ ادا کرنے کے بعد امام کی پیروی شروع کرتا تھا۔ پھر یہ طریقہ مقرر کیا گیا کہ جماعت میں جس مرحلے پہ بھی آکر شریک ہو امام کی پیروی میں نماز پڑھنی شروع کردو۔ پھر امام کے سلام پھیر دینے کے بعد اٹھ کر اپنی نماز پوری کرو۔ اسی طرح روزے کے احکام بھی بتدریج آئے ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے، اور ایک روزہ محرم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کیے، مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلادے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے ضرور رکھے جائیں۔ اور تندرست مقیم آدمی کے لیے فدیے کی رعایت منسوخ کردی۔ پہلے لوگ افطار کے بعد اس وقت تک کھانا پینا، مباشرت کرنا جائز سمجھتے تھے جب تک سو نہ جائیں۔ سونے کے بعد وہ سمجھتے تھے کہ دن کا روزہ شروع ہوگیا۔ اگرچہ اس باب میں کوئی صریح حکم نہ تھا۔ مگر لوگ ایسا ہی سمجھے ہوئے تھے۔ بعد میں حکم آیا

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ إلی قولہ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۔ (ابن کثیر۔ ج ۱۔ ص ۲۱۴)۔

اس مضمون کی تائید میں بخاری، مسلم، ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے متعدد روایات نقل کی ہیں۔ جو حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ مشہور مفسر ابنِ جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے پوری سند کے ساتھ جن صحابہ اور تابعین سے اس کی تائید میں روایات نقل کی ہیں ان کے نام یہ ہیں، معاذ بن جبلؓ، ابن عمرؓ، ابن عباس، سلمہ بن اکوع، علقمہ، عکرمہ حسن بصری، شعبی، عطار، زہری۔ ان میں سے ایک روایت میں وہ حضرت معاذ بن جبل کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے چونکہ اہل عرب روزوں کے عادی نہ تھے اور روزہ ان پر سخت گراں گزرتا تھا۔ اس لیے ان کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ رمضان میں جس دن روزہ نہ رکھیں اس دن کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں تاکیدی حکم آگیا کہ پورے مہینے کے روزے رکھو الّا یہ کہ تم مریض ہو یا سفر پر ہو۔ ایک اور روایت میں وہ ابن عباسؓ کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے سال کے روزوں میں اللہ تعالیٰ نے فدیے کی رخصت رکھی تھی، مگر دوسرے سال جو حکم آیا اس میں مریض و مسافر کی رعایت تو بحال تھی۔ لیکن مقیم کے لیے فدیے کی رعایت کا ذکر نہ تھا، اس لیے یہ رعایت منسوخ ہوگئی۔

اس تشریح سے ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ حدیث سے بے نیاز ہو کر بلکہ احادیث کو حقارت اور تضحیک کے ساتھ پھینک کر قرآن سے من مانے احکام نکال رہے ہیں وہ کس طرح خود گمراہ ہو رہے ہیں اور عام مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن رجب ۱۳۷۱ھ مطابق اپریل مئی ۱۹۵۲ء)۔

جرابوں پر مسح

سوال :۔

موزوں اور جرابوں پر مسح کے بارے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے
میں آج کل تعلیم کے سلسلے میں سکاٹ لینڈ کے شمالی حصے میں مقیم ہوں یہاں
جاڑے کے موسم میں سخت سردی پڑتی ہے، اور اونی جراب کا ہر وقت پہننا
ناگزیر ہے۔ کیا ایسی جراب پر بھی مسح کیا جا سکتا ہے؟ براہ نوازش اپنی
تحقیق احکام شریعت کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

جواب :۔

جہاں تک چمڑے کے موزوں پہ مسح کرنے کا تعلق ہے اس کے جواز پر قریب
قریب تمام اہلِ سنت کا اتفاق ہے۔ مگر سوتی اور اونی جرابوں کے معاملے میں عموماً ہمارے
فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ موٹی ہوں، اور شفاف نہ ہوں کہ ان کے نیچے
سے پاؤں کی جلد نظر آئے، اور وہ کسی قسم کی بندش کے بغیر خود قائم رہ سکیں۔
میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ان شرائط کا ماخذ
کیا ہے۔ مگر سنت میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی۔ سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ
ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتوں پہ مسح فرمایا ہے۔ نسائی کے سوا
کتب سنن میں اور مسند احمد میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم نے وضو کیا اور مَسَحَ عَلَى الجوربين والنعلين (اپنی جرابوں اور
جوتوں پہ مسح فرمایا)۔ ابو داؤد کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، براء

ابن عازب، انسؓ بن مالک، ابو امامہؓ، سہلؓ بن سعد اور عمروؓ بن حریث نے جرابوں پہ مسح کیا ہے۔ نیز حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ فعل مروی ہے۔ بلکہ بیہقی اور طحاوی نے اوس بن ابی اوس سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صرف جوتوں پہ مسح فرمایا ہے۔ اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہی عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور صرف جوتے، اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پہ مسح کرنا بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پہ مسح کرنا۔ ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو، اور نہ یہی ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پہ حضورؐ نے اور مذکورہ بالا صحابہؓ نے مسح فرمایا وہ کس قسم کی تھیں۔ اس لیے میں یہ کہنے پہ مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اور فقہاء چونکہ شارع نہیں ہیں، اس لیے ان کی شرطوں پہ اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گنہگار نہیں ہو سکتا۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ جرابوں پہ اس صورت میں آدمی مسح کر سکتا ہے جبکہ آدمی اوپر سے پہنے رہے۔ لیکن اوپر جن صحابہ کے آثار نقل کیے گئے ہیں ان میں سے کسی نے بھی اس شرط کی پابندی نہیں کی ہے۔

مسح علی الخفین پہ غور کر کے میں نے جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ تیمم کی طرح کی ایک سہولت ہے جو اہل ایمان کو ایسی حالتوں کے لیے دی گئی ہے جبکہ وہ کسی صورت سے پاؤں ڈھانکے رکھنے پہ مجبور ہوں اور بار بار پاؤں دھونا ان کے لیے موجب نقصان یا وجہ مشقت ہو۔ اس رعایت کی بنا اِس

مفروضے پہ نہیں ہے کہ طہارت کے بعد موزے پہن لینے سے پاؤں نجاست سے محفوظ رہیں گے اس لیے ان کو دھونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ اس کی بنا اللہ کی رحمت ہے جو بندوں کو سہولت عطا کرنے کی مقتضی ہوئی۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو سردی سے یا راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لیے یا پاؤں کے کسی زخم کی حفاظت کے لیے آدمی پہنے اور جس کے بار بار اتارنے اور پھر پہننے میں آدمی کو زحمت ہو، اس پہ مسح کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ اُونی جراب ہو یا سُوتی، چمڑے کا جوتا ہو یا کرپچ کا، یا کوئی کپڑا ہی ہو جو پاؤں پہ لپیٹ کر باندھ لیا گیا ہو۔

میں جب کسی کو وضو کے بعد مسح کے لیے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ بندہ اپنے خدا سے کہہ رہا ہے کہ "حکم ہو تو ابھی یہ موزے کھینچ لوں اور پاؤں دھو ڈالیں، مگر چونکہ سرکار ہی نے رخصت عطا فرمادی ہے اس لیے مسح پہ اکتفا کرتا ہوں"۔ میرے نزدیک دراصل یہی معنی مسح علی الخفین وغیرہ کی حقیقی روح ہیں اور اس روح کے اعتبار سے وہ تمام چیزیں یکساں ہیں جنہیں اُن ضروریات کے لیے آدمی پہنے جن کی رعایت ملحوظ رکھ کر مسح کی اجازت دی گئی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۱۳۷۱ھ۔ جون، جولائی ۱۹۵۲ء)

معاشرتی مسائل

مہر غیر مؤجل کا حکم

سوال :-

اگر بوقتِ ضرورت زرِ مہر کی صرف تعداد مقرر کر دی گئی اور اس امر کی تصریح نہ کی گئی ہو کہ یہ مہر معجل ہے یا مؤجل تو آیا اس کو معجل قرار دیا جائے گا یا مؤجل ؟ اس مسئلہ میں علماء سے استفسار کیا گیا مگر جواب مختلف آئے۔ مثلاً چند جوابات یہ ہیں :-

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب و دیگر علماء دہلی :-

"اگر مہر میں مؤجل کی تصریح بھی ہو مگر اجل مجہول بجہالتِ فاحشہ ہو تو مہر معجل ہو جاتا ہے اور جبکہ معجل یا مؤجل کا لفظ استعمال نہ کیا جائے بلکہ واجب الاداء کا لفظ لکھ دیا جائے تو یہ بھی معجل ہوگا کیونکہ بغیر ذکرِ اجل کے مؤجل نہیں ہو سکتا۔ الا اذا اجهل الاجل جهالة فاحشة فيجب حالاً۔ غایہ (ردمختار) وان كانت جهالة متفاحشة كالى الميسرة

الی ھبوب الریح الی ان تمطر السماء فالاجل لا یثبت ویجب المھر حالا ۔ وکذا غایۃ البیان ۔ (رد المختار)

مولانا سعید احمد صاحب مدرس مدرسہ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ ۔

"مہر مؤجل اس وقت ہوگا جب بوقت عقد نکاح ادائے مہر کے لیے وقت اور تاریخ کی تعیین ہو ۔ یہی حال تمام معاملات کا ہے ۔ اگر کسی نے ایک دکان سے کوئی چیز خریدی اور بات چیت میں نقد یا تاخیر تعیین کا ذکر نہیں آیا تو یہ معاملہ بھی معجل کے حکم میں ہوگا ، خریدار خواہ فوراً قیمت دیدے یا بعد میں دینے کا وعدہ کرے ۔ بہر صورت معجل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوض فوراً ادا کیا جائے بلکہ صاحب حق کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ فوراً یا جب چاہے اپنے حق کا مطالبہ کرے اور معاملۂ مؤجلہ میں اجل اور تاریخ سے پہلے مطالبہ اور تقاضے کا حق حاصل نہیں ہوگا ۔ اس تفصیل کی رُو سے معاملہ مسئولہ میں زر مہر معجل ہے اس لیے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ دو دعویٰ کر سکتی ہے ۔"

مولانا سید سلیمان ندوی :۔

زر مہر میں اگر معجل یا مؤجل کی کوئی تفصیل نہیں ہے تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا ۔ وقایہ میں ہے والمعجل والمؤجل ان بینا فذالک والا فالمتعارف ۔ اگر معجل اور مؤجل دونوں بیان کر دیے گئے ہیں تو جیسا بیان کر دیا گیا ہے ویسا ہوگا ورنہ عرف کا اعتبار ہوگا ۔"

مولانا عبدالرحمن صاحب نائب مفتی ریاست پٹیالہ و دیگر علماء :-

"اس صورت میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا (حوالہ دہی مختصر وقایہ کا ہے) اگر عرف یہ ہے کہ ایک عورت ایسے غیر معین مہر کو صرف شوہر کی وفات یا طلاق ہی کے بعد حاصل کر سکتی ہے تو وہ شوہر کی وفات یا طلاق سے پہلے اسے وصول کرنے کا حق نہیں رکھتی"

اس اختلاف کا حل کیا ہے؟ براہ کرم آپ اس پہ تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب :-

قرآن و حدیث کی رُو سے مہر دراصل اس حق زوجیت کا معاوضہ ہے جو ایک مرد کو اپنی بیوی پہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے :-

وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم

(النساء - ۲۴)

ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ اپنے مالوں کے عوض ان سے طلب نکاح کرو۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً

(النساء ۲۴)

پس جو لطف تم نے ان سے اٹھایا ہے اس کے ان کے مہر بطور ایک فرض کے ادا کرو۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضٰى بَعْضُكُمْ إِلٰى بَعْضٍ۔ (النساء ۲)

اور تم وہ مال کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم میں سے ایک دوسرے سے اختلاط کر چکا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہر ہی وہ چیز ہے جس کے عوض مرد کو عورت پر شوہرانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ پھر اس کی مزید تصریح وہ احادیث کرتی ہیں جو اس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ صحاح ستہ اور دارمی اور مسند احمد میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:۔

احق الشروط ان توفوا به ما استحللتم به الفروج۔

تمام شرطوں سے بڑھ کر جو شرط اس کی مستحق ہے کہ تم اسے پورا کرو وہ شرط وہ ہے جس پر تم عورتوں کی شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو۔

لعان کا وہ مشہور مقدمہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زوجین کے درمیان تفریق کرائی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ جب تفریق ہو چکی تو شوہر نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا مال مجھے واپس دلوایا جائے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

لا مال لك ان كنت صدقت عليها فهو بما استحللت من فرجها وان كنت كذبت عليها فذلك ابعد لك منها

(مسلم۔ کتاب اللعان)

مال لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو اس کی شرمگاہ جو تو نے اپنے لیے حلال کی تھی اس کے معاوضہ میں وہ مال

ادا ہو چکا، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال لینے کا حق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔ (مسلم۔ کتاب اللعان)

اس سے بھی زیادہ تصریح ایک اور حدیث میں ہے جو امام احمد اپنی مسند میں لائے ہیں کہ:

من تزوج امرأة بصدق ونوى ان لا يؤديه فهو زان۔

جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ یہ مہر دینا نہیں ہے وہ زانی ہے۔

ان تمام نصوص سے مہر کی یہ حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی رسمی و نمائشی چیز نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جس کے معاوضہ میں ایک عورت ایک مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ اور ان نصوص کا اقتضاء یہ ہے کہ استحلال فرج کے ساتھ ہی پورا مہر فوراً واجب الادا ہو جائے۔ الّا یہ کہ زوجین کے درمیان اس کو مؤخر کر دینے کے لیے کوئی قرار داد ہو چکی ہو۔

پس زر مہر کی ادائیگی میں اصل تعجیل ہے نہ کہ تاجیل۔ مہر کا حق یہ ہے کہ وہ استحلال فرج کے ساتھ بر وقت ادا ہو، اور یہ محض ایک رعایت ہے کہ اس کو ادا کرنے میں مہلت دی جائے۔ اگر مہلت کے بارے میں زوجین کے درمیان کوئی قرار داد نہ ہوئی ہو تو اعتبار اصل (یعنی تعجیل) کا کیا جائے گا نہ کہ رعایت (یعنی تاجیل اور مہلت) کا۔ یہ بات شارع کے منشاء کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے کہ تاجیل کو اصل قرار دیا جائے اور تاجیل و تعجیل کے غیر مصرح ہونے کی صورت میں زر مہر کو آپ سے آپ مؤجل ٹھیرا یا جائے۔

فقہاء حنفیہ کے درمیان اس مسئلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ غایۃ البیان میں ہے :-

فان کان بشرط التعجیل او مسکوتاً عنہ یجب حالا ولہا ان تمنع نفسہا حتی یعطیہا المھر۔

اگر مہر بشرطِ تعجیل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو (کہ معجل ہے یا مؤجل) تو وہ فوراً واجب ہوگا اور عورت کو حق ہوگا کہ اپنے آپ کو شوہر سے روک لے جب تک وہ مہر ادا نہ کرے۔

اور شرح العنایہ علی الہدایہ میں ہے :-

فان سمو المھر ساکتین عن التعجیل والتاجیل ماذا یکون حکمہ ؟ قلت یجب حالا فیکون حکمہ حکم ماشرط تعجیلہ۔

پھر اگر مہر مقرر کر دیا گیا اور معجل یا مؤجل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا تو اس کا کیا حکم ہے ؟ میں کہتا ہوں کہ وہ فوراً واجب ہوگا۔ اس کا حکم اُس مہر کا سا حکم ہے جس کے لیے تعجیل کی شرط کی گئی ہو۔

اور اسبیجابی میں ہے :-

ان کان المھر معجلا او مسکوتاً عنہ فانہ یجب حالا لان النکاح عقد معاوضۃ وقد تعین حقہ فی الزوجۃ فوجب ان یتعین حقہا وذلک بالتسلیم۔

اگر مہر معجل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا تو وہ فوراً واجب ہوگا کیونکہ نکاح ایک عقد با معاوضہ ہے، جب زوجہ میں شوہر کا حق متعین

ہو گیا تو واجب آیا کہ عورت کا حق بھی متعین ہو جائے اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہر اوا کر دیا جائے۔

مہاوہ مہر اگر وہ، تو وہ کہتا ہے کہ اس معاملہ میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا

فتاوی قاضی خان میں ہے :-

فان لم یبینوا قدر المعجل ینظر الی المرأة والی المھر انہ کم یکون المعجل لمثل ھذہ المرأة من مثل ھذا المھر فیعجل ذلک ولا یتقدر بالربع والخمس بل یعتبر التعارف۔

اگر معجل کی مقدار واضح نہ کی گئی ہو تو دیکھا جائے گا کہ عورت کس طبقہ کی ہے اور مہر کتنا ہے اور یہ کہ ایسی عورت کے لیے ایسے مہر میں سے کس قدر معجل قرار دیا جائے۔ بس اتنا ہی مقدار معجل قرار دی جائے ایک چوتھائی یا پانچویں حصہ کی تعیین نہ کر دینی چاہیے جو رواج ہو اس کا اعتبار کرنا چاہیے۔

اسی رائے کی تائید علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے وہ لکھتے ہیں

وان لم یشترط تعجیل شیئ بل سکتوا عن تاجیلہ وتعجیلہ فان کان عرف فی تعجیل بعضہ وتاخیر باقیہ الی الموت او المیسرۃ او الطلاق فلیس لہا ان تحتبس الا الی تسلیم ذلک القدر۔

اور اگر کسی حصہ مہر کی تعجیل کی شرط نہ کی گئی ہو بلکہ تعجیل اور تاجیل کے بارے

میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو رواج کو دیکھا جائے گا۔ اگر یہ رواج ہے کہ ایک حصہ معجل قرار دیا جاتا ہے اور باقی حصہ موت تک یا خوشحالی یا طلاق تک مؤخر رکھا جاتا ہے تو عورت صرف اتنی ہی مقدار وصول ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے روکنے کا حق رکھتی ہے۔

اصولی حیثیت سے دیکھا جائے تو پہلے گروہ کی رائے قرآن و حدیث کے منشا سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کی رائے بھی بے وزن نہیں ہے۔ ان کے قول کا مدعا یہ نہیں ہے کہ مہر کے باب میں تاجیل اصل ہے اور جب تاجیل و تعجیل کی صراحت نہ ہو تو معاملہ اصل یعنی تاجیل کی طرف راجع ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ اپنے فتوے میں ایک اور قاعدے کا لحاظ کرتے ہیں جسے شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں معاملات کے متعلق جو طریقہ عام طور پر مروج ہو اس کی حیثیت افراد کے درمیان ایک بے لکھے معاہدے کی سی ہوتی ہے، اگر اس سوسائٹی کے دو فریق باہم کوئی معاملہ طے کریں اور کسی خاص پہلو کے بارے میں بصراحت کوئی قرارداد نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس پہلو میں وہ مروجہ طریقہ پر راضی ہیں۔

بلاشبہ یہ قاعدہ شریعت میں مسلم ہے، اور اس لحاظ سے فقہاء کے دوسرے گروہ کی رائے بھی غلط نہیں ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم کسی خاص سوسائٹی میں اس قاعدے کو جاری کریں، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت نے رواج کو بطور ایک ماخذ قانون (Source of Law) کے تسلیم نہیں کیا ہے کہ جو کچھ رواج ہو وہی شریعت کے نزدیک حق ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ غیر متقی سوسائٹی اور

اس کے بغیر متعصبانہ رواجوں کو قبول کرنے کے بجائے ان کو بدلنا چاہتی ہے اور صرف ان رواجوں کو تسلیم کرتی ہے جو ایک اصلاح شدہ سوسائٹی میں شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ لہٰذا رواج کو بے لکھا معاہدہ مان کر مثلِ قانون نافذ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس سوسائٹی کے رواج کو ہم یہ حیثیت دے رہے ہیں کیا وہ ایک متقی سوسائٹی ہے؟ اور کیا اس کے رواج شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کی پیروی میں پیدا ہوئے ہیں؟ اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں ملے تو اس قاعدے کو مثلِ قانون جاری کرنا عدل نہیں بلکہ قطعاً ایک ظلم ہوگا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنے ملک کی موجودہ مسلم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تعلقاتِ مرد و زن کے معاملہ میں اس نے خواہشاتِ نفس کی پیروی اختیار کرکے اس توازن کو بہت کچھ بگاڑ دیا ہے جو شریعت نے قائم کیا تھا، اور بالعموم اس کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہے جو شریعت کی روح اور اس کے احکام سے صریحاً منحرف ہیں۔ اسی مہر کے معاملہ کو لے لیجئے جس پر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس ملک کے مسلمان بالعموم مہر کو محض ایک رسمی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اس کی وہ اہمیت قطعاً نہیں ہے جو قرآن و حدیث میں اس کو دی گئی ہے۔ نکاح کے وقت بالکل ایک نمائشی طور پر مہر کی قرارداد ہو جاتی ہے مگر اس امر کا کوئی تصور ذہنوں میں نہیں ہوتا کہ اس قرارداد کو پورا بھی کرنا ہے۔ بارہا ہم نے مہر کی بات چیت میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے" گویا یہ فعل ضابطہ کی خانہ پُری کے لیے

کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علم میں ۸۰ فیصدی نکاح ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر سرے سے کبھی ادا ہی نہیں کیا جاتا۔ زرِ مہر کی مقدار مقرر کرنے میں اکثر جو چیز لوگوں کے پیشِ نظر ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ اسے طلاق کی روک تھام کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس طرح عملاً عورتوں کے ایک شرعی حق کو کالعدم کر دیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی گئی کہ جس شریعت کی رُو سے یہ لوگ عورتوں کو مردوں پہ حلال کرتے ہیں وہ مہر کو استحلالِ فروج کا معاوضہ قرار دیتی ہے اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی نیت نہ ہو تو خدا کے نزدیک عورت مرد پہ حلال ہی نہیں ہوتی۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جس سوسائٹی کا عرف اتنا بگڑ چکا ہو اور جس کے رواج نے شریعت کے احکام اور اس کی روح کے بالکل خلاف صورتیں اختیار کر لی ہوں، اس کے عرف و رواج کو از روئے شریعت جائز قرار دینا کس طرح ہو سکتا ہے۔ جن فقہاء کی عبارتیں اعتبارِ عرف کی تائید میں نقل کی جاتی ہیں، ان کے پیشِ نظر نہ یہ بگڑی ہوئی سوسائٹی تھی اور نہ اس کے خلافِ شریعت رواج۔ انہوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ ایک اصلاح شدہ سوسائٹی اور اس کے عرف کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ کوئی مفتی مجرد ان کی عبارتوں کو نقل کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اصولِ شریعت کی روشنی میں ان کی عبارتوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور یہ تحقیق کر لے کہ جن حالات میں انہوں نے وہ عبارتیں لکھی تھیں ان سے وہ حالات مختلف تو نہیں ہیں جن پر آج چسپاں کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب۔ شعبان ۶۲ھ، جولائی۔ اگست ۴۳ء)

غیر محرم قریبی اعزّہ سے پردہ کی صُورت

سوال :-

کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو شرعاً بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ کہ سسرال اور میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہمارے آج کل کے نظام معاشرت میں بالعموم عورتیں پردہ نہیں کرتیں، ان سے پردہ کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیئے تو کن حدود کے ساتھ؟

جواب :-

شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کا بیوی کو حکم دے۔ اور اگر وہ ایسا حکم دے تو ایک مسلمان عورت کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ سورۂ نور کے رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ نے ان رشتہ داروں کی فہرست دے دی ہے جن کے سامنے ایک مسلمان عورت اپنی زینت کے ساتھ آ سکتی ہے۔ ان کے سوا کسی کے سامنے اظہار زینت کا حکم دینا کسی مسلمان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہن سہن ہوتا ہے ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بالکل غیر مردوں سے پردہ کی نوعیت ہے۔ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے بلغیر زینت کے سادہ لباس میں، پورے ستر کے ساتھ آ سکتی ہیں، مگر صرف اس حد

تک ان کے سامنے رہنا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو۔ یہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنا اور تنہائی میں بیٹھنا، جس کا رواج ہماری موجودہ سوسائٹی میں بڑی کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے، شرعی احکام کے قطعی خلاف ہے، اور بعض رشتہ داروں مثلاً دیوروں کے ساتھ ایسے تعلقات کی تو حدیث میں صریح ممانعت موجود ہے۔

اس معاملہ میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ شریعت کا جو حکم ہے وہ میں نے بتا دیا ہے۔ مگر مسلمانوں میں مدت سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے بڑی جرأت اور عزم کی ضرورت ہے۔ ایک طرف بکثرت مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں جو شریعت کے مطالبات سے بڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف یہی لوگ رشتہ داروں کے معاملہ میں تمام حدودِ شرعیہ کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر کوئی شخص احکامِ شریعت پر ٹھیک عمل درآمد کرنا چاہے تو شاید بہت سے خاندانی تعلقات کو توڑے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۱۳۶۴ھ۔ جولائی، اگست ۱۹۴۵ء)

پردہ کے متعلق چند عملی سوالات

سوال:۔

آپ کی کتاب "پردہ" کے مطالعہ کے بعد میں نے اور میری اہلیہ نے

چند ہفتوں سے عائلی زندگی کو قوانین الٰہیہ کے مطابق بنانے کی سعی شروع کر رکھی ہے۔ مگر ہمارے اس جدید رویّہ کی وجہ سے پورا خاندان بالخصوص ہمارے والدین سخت برہم ہیں اور پردہ کو شرعی حدود و ضوابط کے ساتھ اختیار کرنے پر برافروختہ ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ کہیں ہم ہی بعض مسائل میں غلطی پر نہ ہوں۔ پس تسلی کے لیے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتے ہیں :-

(۱) سورۂ احزاب کی یہ آیت کہ "عورتوں پر کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپوں کے سامنے پردہ نہ کریں اور نہ اپنے بیٹوں کے سامنے .... الخ"

اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ آیت میں جن اعزّہ کا ذکر ہے ان کے سوا عورتوں کا کسی دوسرے کے سامنے کسی بھی شکل اور حالت میں آنا (الاّ بہ اشد مجبوری) صریحاً گناہ ہے۔ اس معاملہ میں غیر محرم رشتہ دار اور غیر محرم اجانب بالکل برابر ہیں۔ کیا میرا خیال صحیح ہے؟

(۲) کیا غیر محرم اعزّہ (مثلاً چچا زاد بھائی یا خالو جب خالہ زندہ ہوں) کے سامنے ہونا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کن مواقع کے لیے اور کن طریقوں کے ساتھ جائز ہے؟

(۳) اگر کسی غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ ایک ہی مکان میں مجبوراً رہنا ہو یا کوئی غیر محرم عزیز بطور مہمان آ رہے تو ایسی حالت میں پردہ کس طرح کیا جا سکے گا؟ اسی طرح کسی قریبی عزیز کے ہاں جانے پر اگر زنانے سے بلاوا آئے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟

(۴) اگر گھروں میں جوان ملازم کام کاج کے لیے آئیں جائیں تو سن رسیدہ عورتوں

عورتوں کے لیے تو جو رخصت ہے وہ مجھے معلوم ہے مگر جوان عورتیں کیا
صرف یہ کہہ کر ان کے سامنے بے پردہ ہو سکتی ہیں کہ ہماری نیت پاک ہے؟
(۵) اگر خدا و رسول کے احکام کے تحت پردہ اختیار کرنے میں کسی
کی والدہ آمادہ ہو تو اس کے حکم کو رد کیا جا سکتا ہے یا نہیں، جبکہ آپ
کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔
(۶) کیا عورتوں کو مردوں اور عورتوں کے مشترکہ جلسوں میں نقاب
اوڑھ کر تقریر کرنی جائز ہے؟ حدیث کی رو سے تو عورتوں کی آواز کا غیر
محرم مردوں تک پہنچنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا۔
(۷) کیا عورتیں لیڈی ڈاکٹر یا نرس یا معلمہ بن سکتی ہیں؟ جیسا کہ ہماری
قوم کے بڑے بڑے لیڈروں نے قوم کو اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ
ہماری عورتیں سب کاموں میں حصہ لے کر گزشتہ نقصانات اور پسماندگی کی
تلافی کریں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورتیں کیا ان مشاغل کو اختیار کر سکتی ہیں
اور آیا انہیں پردہ میں رہ کر ہی انجام دینا ہوگا یا ضرورۃً پردہ سے باہر
بھی آسکتی ہیں؟
(۸) کیا عورتیں چہرہ کھول کر یا نقاب کے ساتھ جہاد میں شرکت کر
سکتی ہیں؟

جواب:۔

(۱) آپ نے قرآن مجید کے اصل الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ آیت جس
کا حوالہ آپ دے رہے ہیں، سورۂ احزاب میں نہیں ہے بلکہ سورۂ نور میں ہے

اور اس میں الفاظ یہ ہیں کہ " وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا ..... " یعنی بجز ان لوگوں کے اور کسی کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں گھر سے باہر بناؤ سنگھار اور آرائش کے ساتھ غیر محرم لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔ دوسری طرف گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ " يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ..... " یعنی اپنی چادروں کو اپنے اوپر گھونگھٹ کے طور پر لٹکا لیا کریں۔ ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کے لیے الگ احکام ہیں۔ ایک وہ محرم رشتہ دار وغیرہ جن کا ذکر سورۂ نور والی آیت میں آیا ہے۔ دوسرے بالکل اجنبی لوگ جن کا حکم سورۂ احزاب والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ تیسرے ان دونوں کے درمیان ایسے لوگ جن کا حکم نہیں ہیں اور اجنبی بھی نہیں۔ پہلی قسم کے مردوں کے سامنے عورت اپنے بناؤ سنگھار کے ساتھ آسکتی ہے۔ دوسری قسم کے مردوں کو چہرہ تک نہیں دکھا سکتی۔ رہے تیسری قسم کے لوگ تو ان سے پردے کی نوعیت مذکورۂ بالا دونوں صورتوں کے درمیان رہے گی۔ یعنی نہ تو ان سے بالکل اجنبیوں کا سا پردہ ہوگا اور نہ ان کے سامنے زینت کا اظہار ہی کیا جائے گا۔

(۲) سامنے ہونے کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس طرح کی آزادی اور بناؤ سنگھار کے ساتھ سامنے ہونا جیسے باپ بھائی وغیرہ کے سامنے ہوا جاتا ہے، اور بے تکلف بیٹھ کر بات چیت کرنا، ہنسنا، بولنا، حتیٰ کہ تنہائی تک میں ساتھ رہنا۔ یہ چیز کسی قسم کے غیر محرم مردوں کے ساتھ بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ اجنبی ہوں یا رشتہ دار۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ

عورت اپنی زینت کو چادر وغیرہ سے چھپا کر، نیز سر کو ڈھانک کر صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے ہوئے کسی کے سامنے آ لے، اور وہ بھی اپنے آپ کو دکھانے کی غرض سے نہیں بلکہ ان ناگزیر ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے جو مشترک خاندانی معاشرت میں پیش آتی ہیں۔ مگر آزادی کے ساتھ بیٹھ کر خلاملا نہ کرے۔ خلوت میں بھی اس کے ساتھ نہ رہے، اور صرف اس طرح سامنے ہو کہ مثلاً اس کے سامنے سے گذر جائے یا کوئی ضروری بات ہو تو پوچھ لے یا بتا دے۔ اس حد تک غیر محرم اعزّہ کے سامنے ہونے کی شرعاً اجازت ہے یا کم از کم ممانعت نہیں ہے۔ بہرحال چچا زاد بھائیوں اور خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ جو ہنسی مذاق اور انتہائی بے تکلفی آج مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہے اور جس طرح مسلمان لڑکیاں اس قسم کے عزیزوں کے سامنے بنی ٹھنی رہتی ہیں، شریعت اسلامیہ میں اِن بے اعتدالیوں کے لیے کوئی وجۂ جواز نہیں ہے۔

(۳) ایسے حالات میں اگر شریعت کی پابندی کا ارادہ دونوں طرف موجود ہو تو صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ جب کوئی غیر محرم عزیز گھر میں آئے تو شرعی قاعدہ کے مطابق استیذان (طلبِ اجازت) کرے[1]۔ پھر جب ایسی آواز آئے تو عورت کو

---

[1] افسوس ہے کہ قرآن و سنت کے حکم استیذان کو آج مسلمانوں نے اپنی معاشرت سے بالکل ہی خارج کر دیا ہے اور اجازت مانگے بغیر گھر میں گھس آنے کو بے تکلفی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ شرعاً خود گھر کے مردوں، حتیٰ کہ باپوں، بیٹوں اور بھائیوں کو بھی لازم ہے کہ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگیں تو کم از کم کھنکار دیں یا کوئی ایسی آواز (بقیہ صفحہ ۸۴ پر)

چاہیئے کہ کوئی چیز اوڑھ کر اپنی زینت کو چھپالے اور ذرا اپنا رُخ بدل لے اور پیٹھ موڑ لے۔ اگر بالکل ناگزیر ہو تو چہرہ اور ہاتھ غیر محرم عزیز کے سامنے ظاہر ہونے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح بضرورت سادگی کے ساتھ بات کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ہنسی مذاق بالکل ناجائز ہے۔

(۴) ملازموں کے معاملہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی رائے یہ ہو کہ وہ "غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ" کی تعریف میں آتے ہیں (یعنی اپنے آقا کے گھر کی عورتوں کے متعلق کوئی بُرا خیال ان کے دل میں آنے کی توقع نہیں ہے) ان کو گھر میں آنے جانے اور کام کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ لیکن جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی یہ رائے نہ ہو، ان کا گھروں میں آنا جانا جائز نہیں ہے۔ بہرحال اس معاملہ میں گھر کے قوام کا اجتہاد معتبر ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو، نہ کہ حدودِ شریعت کو بے پروائی کے ساتھ ٹالنے والا ہو۔

(۵) ماں کے پاؤں کے نیچے جنت بے شک ہے، لیکن یہ حکم صرف اُسی ماں کا مانا جا سکتا ہے جو جنتیوں کے سے کام کرے، یعنی خدا و رسول کے احکام کے آگے جھکنے والی ہو اور اپنے نفس یا خاندانی رواجوں پر شریعت کو قربان کر دینے والی نہ ہو۔ رہی وہ ماں جو اس کے برعکس صفات رکھتی ہو تو اس کی

کر دیں جس سے گھر کی عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی مرد آ رہا ہے۔

خدمت تو کی جاتی رہے گی، مگر غیر شرعی امور میں اس کی اطاعت نہیں کی جاسکتی شریعت کی پابندی سے آزاد ہو کر اور اپنے نفس یا برادری کی شریعت کو خدا کی شریعت پر ترجیح دے کر تو اس نے اپنا قدم خود جہنم کی طرف ڈال دیا۔ پھر آخر اس کے پاؤں کے نیچے جنت کیسے ہو سکتی ہے۔

(۶) بعض حالات میں یہ چیز جائز ہے کہ عورت پردے کی پوری پابندی کے ساتھ مردوں کو خطاب کرے، لیکن بالعموم یہ جائز نہیں ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن حالات میں یہ چیز جائز ہے اور کن میں جائز نہیں، صرف ایسے شخص یا اشخاص کا کام ہے جو مواقع اور حالات کو شرعی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور شریعت کے منشاء کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نیت بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

(۷) لیڈر صاحبان کا حوالہ دے کر آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب اسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی یہ حضرات خود اور ان کے اتباع میں مسلمان آج کل کر رہے ہیں تو پھر اسلامی تہذیب اور یورپین تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر تو مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو آج کل یورپ میں ہو رہا ہے لیکن اگر اسلامی تہذیب اُسی تہذیب کا نام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی تو آج کل کے میڈیکل کالجوں اور نرسنگ کی تربیت گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجہ بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے۔ رائج الوقت گرلز کالجوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معلمات بننے کا معاملہ بھی اس سے کچھ بہت مختلف نہیں

ہے۔ البتہ اگر نظامِ تعلیم و تربیت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے طریقہ پر لڑکیوں کو تیار کر کے اُن سے تمدن کے ضروری کاموں کی خدمت لینے پر قادر ہوں تو یقیناً ہم اس کا انتظام کریں گے کہ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے لڑکیوں کو فنِ طب، سرجری، قابلہ گری، نرسنگ اور تربیتِ اطفال کی تعلیم دیں اور ان کو دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم و تربیت دے کر معلمات بھی بنائیں اور ان سے تمدن کی دوسری مختلف ضروری خدمات بھی ایسے طریقوں پر لیں جو اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ضمناً لائقِ تصریح ہے کہ ہم مسلمان اس مغربی نظریہ کے قائل نہیں ہیں کہ تیمارداری (نرسنگ) کا پیشہ عورت کے لیے مخصوص ہے اور یہ کہ زنانہ و مردانہ سب قسم کے ہسپتالوں میں نرس عورت ہی ہونی چاہیئے۔ ہمارے نزدیک اس خیال کے لیے کوئی علمی اور عقلی بنیاد نہیں ہے، اور اخلاقی حیثیت سے یہ نہایت شرمناک ہے کہ نرس خواتین سے مرد بیماروں کی تیمارداری کے وہ کام لیے جائیں جنہیں مرد تیماردار بھی انجام دیتے ہوئے حجاب محسوس کریں۔ اس بنا پر ہم مسلمان لوگ اگر عورتوں کو طبی خدمات کے لیے تیار کریں گے تو عورتوں کے علاج اور تیمارداری کے لیے کریں گے نہ کہ عام طبی خدمات کے لیے۔ ہمارے نزدیک مردانہ ہسپتالوں کے لیے مرد ہی نرس ہونے چاہئیں۔

(۸) جنگ کے موقع پر تیمارداری، مرہم پٹی، مجاہدوں کا کھانا پکانا، اسلحہ اور رسد رسانی، پیغام رسانی وغیرہ کی خدمات انجام دینا عورتوں کے لیے جائز ہے۔ پردے کے احکام سے قبل بھی یہ خدمات عورتیں انجام دیتی تھیں اور ان احکام کے آنے کے بعد بھی دیتی رہیں اور آج بھی دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ

جواز اس شرط سے ہے کہ فوج اسلامی ہو، حدود اللہ کی پابند ہو اور ان بدمعاشیوں سے پاک ہو جن میں آج کل کی فوجوں نے ناموری حاصل کر رکھی ہے (۱-۲-۸-۷۷) جیسے معصوم ناموں سے عورتوں کو بھرتی کرنا اور پھر بدمعاش سپاہیوں اور افسروں کے لیے ان سے قحبہ گری کی خدمت لینا وہ شیطانی کام ہے جس کے لیے کوئی گنجائش برائے نام بھی اسلامی تہذیب میں نہیں نکل سکتی[۱]

(ترجمان القرآن ۔ رمضان ۱۳۶۵ھ ۔ اگست ۱۹۴۶ء)

رسموں کی شریعت

سوال :-

چند اشکال درپیش ہیں ۔ ان کے متعلق شرعی رہنمائی چاہتا ہوں ۔ امید ہے کہ آپ میرے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور پر روشنی ڈالیں گے ۔

---

[۱] آج کل کی فوجوں کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں امریکی فوج نے جاپان میں ایک لاکھ ۔ انگلستان میں ۰ ہزار اور جرمنی میں ۵۰ ہزار حرامی بچے چھوڑے ہیں ۔ اور روسی فوج نے صرف مشرقی برلن میں ۲۹ ہزار حرامی اولاد پیدا کی ہے ۔ یہ صرف ان بچوں کی تعداد ہے جو ۱۹۵۲ء کے آخر تک شمار میں آ گئے ہیں ۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس برتھ کنٹرول کے دور میں کتنے بڑے پیمانے پر بدکاری کی گئی ہوگی تب جا کر یہ نتائج بظہور میں آئے ۔

ا۔ ایک مفلس مسلمان اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ افلاس کے باوجود دنیا والوں کا ساتھ دینے کا بھی خواہشمند ہے، یعنی شادی فرد تزک واحتشام سے کر کے وقتی سی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رہنمائی کیسے کی جائے!

ب۔ ایک مقروض مسلمان جو تمام اثاثہ بیچ کر بھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، بیٹے، بیٹیوں کی شادی کرنا چاہے تو فریق ثانی کی طرف سے ایسی شرائط سامنے آتی ہیں جو بہر حال صَرفِ کثیر چاہتی ہیں تو اس کے لیے کیا راہِ عمل ہے؟

ج۔ عموماً لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ دوسری طرف سے نسبت کے پیغام میں پہل ہو، چنانچہ اسی انتظار میں بعض اوقات لڑکیاں جوانی کو طے کر کے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوتی ہیں اور کنواری رہ جاتی ہیں۔ اس معاملہ میں اسلام کیا چاہتا ہے؟

د۔ موجودہ مسلمان شادی بیاہ، پیدائش اور موت کی تقریبات پر چھٹی، چلہ، باجہ، منگنی، جہیز اور اسی طرح چالیسواں، قل وغیرہ کی جو رسوم انجام دیتے ہیں ان کی حیثیت شریعت میں کیا ہے؟

جواب:۔

ا۔ ایسا شخص جو خود جانتا ہے کہ وہ اتنا خرچ کرنے کے قابل نہیں ہے، اور پھر محض دنیا کے دکھاوے اور اپنی غلط خواہشات کی تسکین کی خاطر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا چاہتا ہے وہ تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو معصیت کے

گڑھے میں پھینک رہا ہے۔ اپنی غلط خواہش کی وجہ سے یا تو وہ سودی قرض لے گا یا کسی ہمدرد کی جیب پہ ڈاکہ ڈالے گا، اور اگر اسے قرض حسن مل گیا جس کی امید نہیں ہے، تو اُسے مار کھائے گا۔ اور اس سلسلہ میں خدا جانے کتنے جھوٹ اور کتنی بے ایمانیاں اس سے سرزد ہوں گی۔ آخر ایسے شخص کو کیا سمجھایا جاسکتا ہے جو محض اپنے نفس کی ایک غلط خواہش کی خاطر اتنے بڑے گناہ جانتے بوجھتے اپنے سر لینے پہ آمادہ ہے۔

ب۔ ایسے شخص کو اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں ان لوگوں میں کرنی چاہئیں، جو مالی حیثیت سے اُسی جیسے ہوں اور جو اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی چادر سے نہ وہ خود زیادہ پاؤں پھیلائیں اور نہ دوسرے کو زیادہ پاؤں پھیلانے پر مجبور کریں۔ اپنے سے بہتر مالی حالات رکھنے والوں میں شادی بیاہ کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشکلات میں مبتلا کرنا ہے۔

ج۔ یہ صورت تو کچھ فطری سی ہے، لیکن اس کو حد سے زیادہ بڑھانا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی لڑکی جوان اور شادی کے قابل ہو چکی ہو اور کوئی مناسب لڑکا نظر آئے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی طرف سے پیغام دینے کی ابتدا کرے۔ اس کی مثالیں خود صحابہ کرام میں ملتی ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت میں کوئی ذلت کی بات ہوتی تو نبی صلعم اس کو منع فرما دیتے۔

د۔ یہ سب چیزیں وہ پھندے ہیں جو لوگوں نے اپنے گلے میں خود ڈال لیے ہیں، ان میں پھنس کر ان کی زندگی اب تنگ ہوئی جا رہی ہے، لیکن اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ان کو کسی طرح چھوڑنے پہ آمادہ نہیں ہوتے۔

اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ براہِ راست اِن رسموں کے خلاف کچھ کہا جائے، بلکہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف دعوت دی جائے۔ خدا اور رسول کے طریقہ پہ لوگ آجائیں تو بڑی خرابیاں بھی دور ہوں گی اور یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی نہ رہیں گی۔

سوال :-

میں عرصے سے تجرّد کی زندگی گذار رہا ہوں اور اس سبب کی ذمّہ داری میرے "اجتہاد" کے سر ہے۔ ہمارے اطراف میں کچھ اس قسم کے اصول و مراسم شائع ہیں جن کے بارے میں اگر فقہی موشگافیوں سے کام لینا شروع کر دیا جائے تو ان کو "ناجائز" اور "غیر شرعی رسم" کہنا مشکل ہوگا۔ مثلاً یہ کہ منسوبہ یا منکوحہ کے لیے زیور و پارچہ جات کا مطالبہ، کچھ آپس کے لین دین، ایک دوسرے کے کمینوں اور خدمت گاروں کو بطور عطیہ و انعام کچھ دینا دلانا، برادری اور اہلِ قرابت کو بلانا اور ان کی ضیافت کرنا وغیرہ۔ یہ بہت سی چیزیں بظاہر اگر علیٰحدہ علیٰحدہ کر کے دیکھی جائیں تو ان میں سے غالباً کسی ایک کو بھی ناجائز نہ کہا جا سکے گا۔ لیکن اگر ان مراسم کے اس پہلو پہ نظر ڈالی جائے کہ ان کی پابندی اور التزام اس حد تک ہے کہ ان کے بغیر کامیابی ہی نہیں ہوتی اور کوئی کسی درجہ کا آدمی کیوں نہ ہو۔ ان کی پابندی قبول کیے بغیر ازدواجی زندگی کا آغاز کر ہی نہیں سکتا تو بالکل صفائی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چیزیں اب صرف

"مباح" کے درجہ پہ باقی نہیں رہی ہیں، بلکہ یہ سب برادری کا ایک قانون بن گئی ہیں اور ایسا قانون کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والا گویا مجرم متصور ہوتا ہے پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر باطل قانون کو توڑ دیا جائے، چاہے وہ کہیں ہو، تو سوال یہ ہے کہ آیا مذکورہ بالا چیزیں اس شکست وریخیت کی مستحق ہیں یا نہیں؟ اگر یہ جملہ کی مستحق ہیں، جیسا کہ میری رائے ہے تو کیا یہ حقیقت آپ سے مخفی ہے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اس قسم کی "شریعتِ رسوم" نافذ العمل نہ ہو، خواہ اس کی تفصیلی اشکال کچھ ہی ہوں۔ جن تقریبات کو آجکل "شرعی تقریبات" کہا جاتا ہے وہ بھی بس صرف اس حد تک "شرعی" ہوتی ہیں کہ ان میں ناچ، باجہ گاجہ اور ایسی ہی دوسری خرافات و مزخرفات نہیں ہوتی، لیکن مذکورہ بالا رسوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود رہتی ہیں اور انہیں "اباحت" کی چادر میں چھپا لیا جاتا ہے۔ پس کیا جماعتِ اسلامی کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے اراکین کو "غیر شرعی رسوم" کی وضاحت اس طرح کرکے بتائے کہ یہ "اباحت" کی قبا چاک ہو جائے اور وہ اپنی تقریبات کو بالکل مسنون طریقہ پہ منائیں۔

اگر ان رسوم کے خلاف میرا احساس صحیح نہ ہو تو پھر کچھ وضاحت سے "شریعتِ رسوم" کے واجبات کو قابلِ بغاوت قوانینِ باطلہ سے مستثنیٰ قرار دینے کی وجوہ تحریر فرمائیں۔ اس سے اگر میرا اطمینان ہو

گی تو تجرّد کی مصیبت سے نجات حاصل ہو سکے گی اور اگر آپ نے میری رائے کی تصدیق کی تو پھر میرے لیے بظاہر کامیابی کا کہیں موقع نہیں ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی مسرت ہوگی، کیونکہ پھر تکلیف مع معنوں میں اللہ کی راہ میں ہوگی۔ ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امرًا۔

جواب:۔

ہم "الاقدم فالاقدم" کے اصول پہ کام کر رہے ہیں۔ پہلے دین کی جڑوں کو دلوں میں جمانا ضروری ہے، اس کے بعد تفصیلات کو ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ زندگی کے مختلف گوشوں اور کونوں میں درست کرنے کا موقع آئے گا۔ اگر ہم شادی بیاہ، لین دین اور دوسرے معاملات کی تفصیلات و جزئیات بیان کرنے پر اتر آئیں تو ہماری اصول دعوت کا کام منتشر ہو جائے گا۔ اس لیے جہاں تک دین کے بنیادی امور کا تعلق ہے ہم ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے ان کے متعلق ہم سر دست اجمال سے کام لے رہے ہیں۔

شادی بیاہ وغیرہ تقریبات کی رسوم کی پوری پوری اصلاح اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ دینی زندگی اپنی صحیح بنیادوں پہ تعمیر ہوتی ہوئی اس مرحلہ پر نہ پہنچ جائے، جہاں ان چیزوں کی اصلاح ممکن ہو۔ اس وقت تک ہمارے ارکان کو زیادہ تر صرف ان چیزوں سے اجتناب پہ اصرار کرنا چاہیے جن کو صریحاً خلافِ شریعت کہا جا سکتا ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو معاشرت اسلامی کی روح کے تو خلاف ہیں مگر مسلمانوں کی موجودہ معاشرت میں قانون و شریعت بنی ہوئی ہیں تو وہ

ہمارے ذوقِ اسلامی پہ خواہ کتنی ہی گراں ہو، لیکن سردست ہمیں ان کو اس امید پہ گوارا کر لینا چاہیے کہ بتدریج ان کی اصلاح ہو سکے گی۔ مگر یہ گوارا کرنا رضامندی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ احتجاج اور فہمائش کے ساتھ ہو۔ یعنی ہر ایسے موقع پہ واضح کر دیا جائے کہ شریعت تو اس طرح کے نکاح چاہتی ہے جیسے ازواجِ مطہرات اور دوسرے صحابہؓ کے ہوئے تھے، لیکن اگر تم لوگ یہ تکلفات کیے بغیر نہیں مانتے تو مجبوراً ہم اس کو گوارا کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ وقت آئے جب تم نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کی طرح سادہ نکاح کرنے کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھو!

ہمارا یہ رویّہ تو عام لوگوں کے لیے ہے جن سے ہم مختلف قسم کے روابط پیدا کرنے اور جن کے ساتھ کئی طرح کے دنیوی امور میں معاملہ کرنے پہ مجبور ہیں۔

لیکن خود ارکانِ جماعت کے درمیان ایسے جتنے روابط اور معاملات بھی ہوں، انہیں رسوم کی آلودگیوں سے پاک کر کے سادگی کی اس سطح پہ لے آنا چاہیے جس تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے انہیں پہنچایا تھا۔ ہمارے معاملات میں مباحات کو مباحات ہی کی حد تک رہنا چاہیے۔ رواج کی رَو میں بہنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو بغاوت کرنا بھی چاہتے ہیں مگر پہل کی جسارت نہیں کر سکتے۔ رسموں کی بیڑیوں سے نجات حاصل تو کرنا چاہتے ہیں مگر دوسروں سے پہلے انہیں کاٹنے کی جرات نہیں رکھتے۔ اپنی پیٹھوں پہ لدے ہوئے رواجوں کے بوجھوں سے ان کی کمریں ٹوٹ رہی ہوتی ہیں مگر ان کو پٹخ دینے میں پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ پہل اور پیش قدمی اب ہم لوگوں کو کرنی ہے۔ ہمارے ہر ساتھی کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے روزمرّہ کے معاملات اور تقریبات کو گوناگوں پابندیوں سے آزاد

کرنے میں پوری بے باکی سے پہل کرے ۔ اور لوگوں کی "ناک" بچانے کے خود نکو بن کر معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرے ۔ خالص اسلامی انداز میں تقریبات اور معاملات کو سرانجام دینے کی مثالیں اگر جگہ جگہ ایک دفعہ قائم کر دی جائیں گی تو سوسائٹی کا کچھ نہ کچھ عنصر ان کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور اس طرح رفتہ رفتہ احوال بدل سکیں گے ۔

سوال :۔

ہمارے علاقے میں عام طور پہ نکاح کا مہر نو صد روپیہ معین ہوتا ہے ۔ اس سے تین سو روپیہ کی ادائیگی ہو جاتی ہے اور چھ سو روپیہ کی رقم وصول طلب رہتی ہے ۔ لیکن بالعموم مرد کی طرف سے اس چھ سو کی ادائیگی کی نوبت کبھی نہیں آتی ۔

ہمارے ایک رشتہ دار کی لڑکی کا نکاح آج سے قریباً ۵ سال قبل ہوا تھا اور اس کا مہر دس ہزار روپیہ قرار پایا تھا ۔ لڑکے کی طرف سے اول اول اتنے بڑے مہر کو تسلیم کرنے میں لیس و پیش ہوتا رہا مگر آخر کار محض اس وجہ سے یہ ہٹ چھوڑ دی گئی کہ یہ سب کچھ ایک نمائشی رسم کے سوا کچھ نہیں ۔
اب اسی رشتہ دار کی دوسری لڑکی کی نسبت میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ طے پائی ہے اور اب جلد ہی اس کا نکاح ہونے والا ہے ۔ لڑکی کے اولیاء کی طرف سے قبل از وقت یہ اطلاع پہنچا دی گئی ہے کہ مہر وہی نو دس ہزار روپیہ مقرر ہو گا ۔ اگر اس رقم میں اب کوئی کمی کی جائے تو ان کا پہلا داماد

بگڑ جائے گا کہ جب اس کے لیے دس ہزار روپیہ رکھا گیا تھا تو اب دوسرے داماد سے کوئی امتیازی رویّہ کیوں اختیار کیا جائے ؟

اس الجھن کو طرفین نے حل کرنے کی صورت یہ سوچی ہے کہ مجلس نکاح میں جب کہ ہمارے عزیزہ کا پہلا داماد موجود ہوگا ، مہر تو یہی نو دس ہزار روپیہ تحریر کیا جائے گا ، مگر بعد میں خفیہ طور پر اس تحریر کو بدل کر نو ہزار نو سو کر دیا جائے گا ۔ اس طرح نہ پہلا داماد ناراض ہوگا نہ ہمارے چھوٹے بھائی پر بار رہے گا ۔

مجھے اس مجوزہ صورت معاملہ میں کھٹک سی ہو رہی ہے اور میں نے اس کا اظہار اپنے والد محترم کے سامنے بھی کر دیا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ علمائے شریعت سے استصواب کر لیں ۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ ایک مقامی مفتی صاحب سے استفتاء کیا جا چکا ہے اور ان کی رائے میں ایک معاملہ میں طرفین جب راضی ہیں تو شریعت معترض نہیں ہو سکتی ۔ اس پر میں نے والد صاحب پر اپنا عدم اطمینان ظاہر کیا ہے ۔

یہی معاملہ جماعت اسلامی کے ایک رکن کے سامنے رکھا تو انہوں نے فرمایا کہ مجوزہ صورت معاملہ میں ایک تو پہلے داماد کو فریب دیا جائے گا اور دوسرے دس ہزار مہر کی بہر حال ایک اور مثال عوام کے سامنے قائم کی جائے گی اور رسم و رواج کی بیڑیوں میں گویا ایک کڑی کا اضافہ کیا جائے گا ۔ اس وجہ سے میں اسے صحیح نہیں سمجھتا ۔

اب مشکل یہ ہے کہ نکاح کی مجلس میں لڑکے کا بھائی ہونے کی وجہ

سے مجھے شریک بھی ہونا ہے اور شاید وکیل یا گواہ بھی بننا پڑے، اور صورت ایسی ہے کہ میرا ضمیر اس کے جائز ہونے کی شہادت نہیں دیتا۔ اگر میں بحیثیت وکیل یا شاہد مجلس میں شریک ہوتا ہوں تو از خود اس غلطی میں حصہ دار ہوں جس کو سوچ سمجھ کر میرے اعزہ کرنے لگے ہیں۔ اگر شرکت سے باز رہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ میں بھائی کی شادی پر خوش نہیں ہوں۔ نیز اگر عدم شرکت کی وجہ مجھ سے پوچھی جائے تو میں خاموش رہنے پر مجبور ہوں، کیونکہ اگر حقیقت بیان کر دوں تو سارا معاملہ درہم برہم ہو کے رہے گا۔

اب براہ کرم آپ میرے لیے صحیح اسلامی رویّہ تجویز فرما دیں انشاء اللہ میں دنیوی تعلقات اور مفاد کو تعمیل میں حائل نہ ہونے دوں گا۔ میں صرف شریعت کا حکم معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے اتباع پر تیار ہوں۔ فرار کے لیے کوئی تاویل مجھے مطلوب نہیں ہے۔

جواب :-

جو معاملہ آپ نے لکھا ہے وہ ایک نمونہ ہے ان غلط کاریوں کا جن میں مسلمان شریعت و اخلاق سے دور ہو کر مبتلا ہو گئے ہیں۔ شریعت نے مہر کو عورت کا ایک حق مقرر کیا ہے اور اس کے لیے یہ طریقہ طے کیا تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان جتنی رقم طے ہو اس کا ادا کرنا مرد پر واجب ہے۔ لیکن مسلمانوں نے شریعت کے اس طریقہ کو بدل کر مہر کو ایک رسمی اور دکھاوے کی چیز بنا لیا۔ اور بڑے بڑے مہر دکھاوے کے لیے باندھنے شروع کیے، جن کے

ادا کرنے کی ابتدا ہی سے نیت نہیں ہوتی اور جو خاندانی نزاع کی صورت میں عورت اور مرد دونوں کے لیے بلائے جان بن جاتے ہیں۔ اب ان غلطیوں سے بچنے کی سیدھی اور صاف صورت یہ ہے کہ مہر اتنے ہی باندھے جائیں جن کے ادا کرنے کی نیت ہو، جن کے ادا کرنے پر شوہر قادر ہو۔ پورا مہر بروقت ادا کر دیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ اس کے لیے ایک مدت کی قرارداد ہونی چاہیے اور آسان قسطوں میں اس کو ادا کر دینا چاہیے۔ اس راستی کے طریقہ کو چھوڑ کر اگر کسی قسم کے حیلے نکالے جائیں گے تو نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ ایک غلطی سے بچنے کے لیے دس قسم کی اور غلطیاں کی جائیں گی جو شرع کی نگاہ میں بہت بری اور اخلاق کے اعتبار سے نہایت بدنما ہیں۔ آپ اپنے نکاح میں وکیل یا گواہ کی حیثیت قبول نہ کریں، بلکہ فریقین کو سمجھانے کی کوشش کریں اور اگر نہ مانیں تو ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دیں۔ نکاح میں شریک ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جھوٹ اور فریب کا گواہ بننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۶۵ھ۔ اکتوبر ۴۶ء)

آلات کے ذریعہ سے توالد و تناسل

سوال :-

کیمیاوی آلات کے ذریعہ سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو، تو یہ عمل معصیت سے

خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں ؟ اور اس عمل کی مفعولہ زانیہ شمار کی جائے گی، اور اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں ؟ اس امر کا خیال رکھیئے کہ آجکل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے وہ اگر سائنٹفک طریقوں سے اپنے حصّہ کا نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کر دے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ امریکہ میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے۔"

جواب :۔

آلات کے ذریعہ سے استقرارِ حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لیے اس عمل کا تصوّر ہی ناقابلِ برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک گرا دی جائے۔ آخر انسان کی صنفِ اناث اور حیوانات کی مادہ میں تو کچھ فرق رہنے دیجئے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہی ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے کہ وہ گھوڑیوں کو اپنے نروں سے ملنے کا لطف حاصل نہیں کرنے دیتا اور ان سے صرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان کی اپنی "مادہ" کے ساتھ بھی یہی برتاؤ شروع ہو جائے تو اس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔

آج کی "فیشن دار" عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل اس کی فطرت کو مصنوعی فکری و صنفی ماحول نے مسخ کر دیا ہے۔ ورنہ اگر وہ

صحیح انسانی فطرت پر ہوتی تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی ۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی قدرتی بنیاد ہے ۔ فطرتِ الٰہی نے عورت اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ اُن میں مؤدت اور رحمت ہو، حسن معاشرت ہو، مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی نشوونما حاصل کرے ۔ اس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے ۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے لہٰذا وہی اولاد جائز اولاد ہے جو قیدِ نکاح میں پیدا ہو ۔ اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے ۔ اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو اُسے حلالی نہیں کہا جا سکتا ۔ شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا ۔ نیز اس کا سلسلۂ آبائی منقطع ہو گا اور وہ باپ کے ورثہ سے محروم رہے گا جو قطعی طور پر اس کی حق تلفی ہے ۔

پھر غور تو کیجیے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار کون ہو گا ؟ صرف ماں ؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچہ کے لیے ماں اور باپ، چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کیے ہیں ان میں سے آدھے ساقط کر دیئے جائیں اور وہ صرف سلسلۂ مادری پر منحصر رہ جائے ؟ کیا دنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور

پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے ؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری قائم رہے مگر حبشیہ کے لیے باپ ہونے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے ؟

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیئے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے "امتحانی نلیوں" میں پالا جائے۔ یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے۔ اور جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی، عورت چاہے گی کہ اسے بچہ جننے کی تکلیف دی جائے، اس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے وہ تیار نہ ہوگی۔

یہ صورت جب رونما ہوگی تو انسانی بچے اسی طرح "کثیر پیداآوری" (Mass Production) کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں۔ یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اس کا اسفل السافلین ہوگا۔ ان "کارخانہ ہائے نسل کشی" سے انسان نہیں بلکہ وہ ٹنگے جانور پیدا ہوں گے، جن میں انسانی شرف اور پاکیزہ انسانی جذبات واحساسات کی خوشبو برائے نام بھی نہ ہوگی اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہوگا جو تمدن کی رنگارنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں تو وہ مادہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں۔ اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے

کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ ۔ جنوری، فروری ۴۴ء)

اسلام اور آلاتِ موسیقی

سوال :۔

(۱) کیا آلاتِ موسیقی بنانا اور ان کی تجارت کرنا جائز ہے؟

(۲) کیا شادی بیاہ کے موقع پر باجے وغیرہ بجانا جائز ہیں؟ نیز تفریحاً ان کا استعمال کیسا ہے؟

(۳) اگر جواب نفی میں ہے تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود ان کا استعمال نہیں کرتے لیکن ایسے تعلق داروں کے ہاں بخوفِ کشیدگی چلے جاتے ہیں۔ جو آلاتِ موسیقی کا استعمال کرتے ہیں؟

(۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونے کی اجازت ہے جہاں آلاتِ موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو؟

(۵) آلاتِ لہو کے حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ آنحضورؐ کے زمانہ میں دَف ہی ایک موسیقی کا آلہ عرب میں رائج تھا، اور آپ نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، لہٰذا ہمارے زمانے میں دَف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں مستعمل ہو گئی ہیں تو ان کا استعمال کیوں نہ روا

ہو ؟

(۶) کیا دَف آلاتِ لہو میں شامل ہے ؟

جواب :-

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میں آلاتِ موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں " اب یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو نبی اس کام کے لیے بھیجا گیا ہو اس کے پیرو انہی آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کے لیے اپنی قوتیں استعمال کریں ۔

(۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور ، باجے بجانا کسی حال میں درست نہیں ۔ حدیث میں جس حد تک اجازت پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شادی اور عید کے موقع پر دَف کے ساتھ کچھ گا لیا جائے ۔

(۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے کہ آدمی اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ناراضی سے ڈر کر ایک ناجائز کام میں حصّہ لے ۔ رسولؐ اور اصحابؓ رسولؐ کے ساتھ جو لوگ جو اپنا حشر چاہتے ہوں اُن کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھیں جنہیں احکامِ شریعت کی پروا نہیں ۔ ورنہ جن کو ان لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں ، انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جا سکتا ۔ جب تمہاری دنیا فاجروں کے ساتھ ہے ۔ تو آخرت میں بھی انہیں کا ساتھ نصیب ہوگا ۔

(۴) جوابؒ ملاحظہ ہو ۔ مگر یہ خیال رہے کہ مجلسِ نکاح میں جبکہ ایجاب و قبول ہو رہا ہو اور منکرات و فواحش کی نمائش نہ ہو رہی ہو شرکت کرنے میں مضائقہ

نہیں، بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی اور شرافت کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمہارے جائز کاموں کا تعلق ہے ہم تمہاری مسرت میں دل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم اِن خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دَف کے سِوا اس زمانہ میں اور کوئی دوسرا آلۂ موسیقی نہ تھا۔ ایران اور روم اور مصر کی تمدنی تاریخ اور خود عرب جاہلیت کی تمدنی تاریخ سے جو شخص جاہلِ محض ہو وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعارِ جاہلیت میں مِلتے ہیں۔

(۶) دَف کا نام اگر آلاتِ موسیقی میں شامل ہو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور عید کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک آدمی جا سکتا ہے۔ اس آخری حد کو جو شخص نقطۂ آغاز بنانا چاہتا ہو اس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ مخواہ اُس نبیؐ کے پیرؤوں میں اپنا نام لکھوائے جو آلاتِ موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے؟

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ۔ جنوری، فروری ۴۴ء)

گڑیوں کا حکم

سوال :-

کیا بچوں کے کھیل کا سامان، مثلاً چینی کی گولیاں، تاش، بیڈ منٹن کی چڑیا اور لڑکیوں کے لیے گڑیاں وغیرہ فروخت کرنا جائز ہے، نیز ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں بھی بیچی جاسکتی ہیں ؟

جواب :-

بچوں کے کھلونے بیچنا بجائے خود ناجائز نہیں ہے الا یہ کہ کسی خاص کھلونے یا کھیل کے سامان میں کوئی شرعی قباحت ہو۔ رہے جانوروں اور آدمیوں کے مجسمے تو ان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پوری باریکی سے تمام خد و خال کے ساتھ انہیں بنایا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ محض ایک سرسری ساڈھانچہ کسی جاندار کا ہو جیسے لکڑی کے گھوڑے اور کپڑے کی گڑیاں۔ پہلی قسم کے مجسموں کی فروخت جائز نہیں ہے۔ البتہ دوسری قسم کے کھلونے آپ بیچ سکتے ہیں۔ رہیں ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں تو اگر وہ مشرکانہ تخیلات کی نمائندہ ہوں، مثلاً کرشن جی کی مورتی یا رام چندر جی کا مجسمہ وغیرہ، تو ان کی فروخت حرام ہے۔

اشتہاری تصویریں

سوال :- اشتہار کے لیے کیلنڈر وغیرہ آج کل عورتوں کی تصاویر

بنانے کا بہت رواج ہے، نیز بعض مشہور شخصیتوں اور قومی رہبروں کی
تصاویر بھی استعمال کی جاتی ہیں، علاوہ بریں تجارتی اشیاء کے ڈبوں اور
بوتلوں اور لفافوں پہ چھاپی جاتی ہیں۔ ان مختلف صورتوں سے ایک
مسلمان تاجر اپنا دامن کیسے بچا سکتا ہے؟

جواب:۔
اگر کوئی اشتہار یا کیلنڈر خود آپ چھپوائیں تو اسے تصویر سے پاک رکھیں۔
اور ضرورتاً اگر آپ کو اپنی ذات کے لیے کیلنڈروں وغیرہ کا استعمال کرنا پڑے
تو اول تو بے تصویر لیجئے، ورنہ تصاویر کو چھپا دیجئے۔ لیکن ڈبوں اور بوتلوں اور
لفافوں پہ آپ کہاں تک تصاویر کو مٹا سکتے ہیں۔ موجودہ تصویر پرست دنیا
نے قسم کھالی ہے کہ کسی چیز کو تصویر سے خالی نہ چھوڑے گی۔ ڈاک کے ٹکٹوں
اور سکوں تک پہ تصاویر موجود ہیں۔ یہ ہمہ گیر نظام طاغوت اپنی ناپاکیوں اور
غلاظتوں کو جڑ سے لے کر شاخوں اور پتوں تک پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ بس اپنی
حدِ امکان تک اپنا دامن بچائیے اور اس حد سے آگے جو کچھ ہے اس سے اپنے
آپ کو اور دنیا کو بچانے کے لیے یہ سعی کیجیے کہ نظامِ باطل کا تسلط ختم ہو اور
نظامِ حق کا اقتدار جمے۔ اس کی جڑ کٹے گی تو شاخیں آپ ہی جھڑ جائیں گی۔

کنیز کی تعریف اور اس کے حلال ہونے کا حکم

سوال:۔ قرآن نے کنیز کی کیا تعریف بیان کی ہے؟ اور کنیز کے

بلا نکاح حلال ہونے کی دلیل کیا ہے ؟

جواب :۔

قرآن میں کنیز کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ " وہ عورت جو زورِ بازو سے حاصل ہو " اور چونکہ قرآن زورِ بازو کے استعمال کو صرف قتال فی سبیل اللہ تک محدود رکھتا ہے اس لیے قرآن کی تعریف کی رُو سے کنیز صرف وہ عورت ہے جو راہِ خدا میں جنگ میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

یہ تعریف اور ایسی عورت کے حلال ہونے کی دلیل اس آیت میں ہم کو ملتی ہے : حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ ...... وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (حرام کی گئیں تمہارے لیے تمہاری مائیں ...... اور وہ عورتیں جو شادی شدہ ہوں ماسوا اُن عورتوں کے جن کے مالک ہوئے تمہارے سیدھے ہاتھ)۔ سیدھا ہاتھ عربی میں قدرت، غلبہ و قہر اور زورِ بازو کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ یہ بجائے خود کنیز کی مذکورہ بالا تعریف کے حق میں کافی دلیل ہے۔ اس پر مزید دلیل یہ ہے کہ وہ شادی شدہ عورت جس کو اس آیت میں حرمت کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، بہر حال وہ عورت تو نہیں ہو سکتی جس کا نکاح دار الاسلام میں ہوا ہو، کیونکہ آیت کا سیاق خود بتا رہا ہے کہ وہ اُن محصنات میں شامل ہے جو حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ کے تحت آتی ہیں اس لیے لامحالہ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد وہی شادی شدہ عورتیں ہوں گی جن کے نکاح دار الحرب میں ہوئے ہوں اور پھر وہ جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔

رہی اُن کے بلا نکاح حلال ہونے کی دلیل، تو وہ یہ ہے کہ اوّل تو مذکورۂ بالا آیت میں جن شادی شدہ عورتوں کو حرام کیا گیا ہے اُن سے وہ عورتیں مستثنیٰ کر دی گئی ہیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔ پھر اس کے بعد فرمایا:
وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ (اور حلال کیا گیا تمہارے لیے ان کے سوا دوسری عورتوں کو اس طور پر کہ تم ان کو اپنے اموال کے بدلے حاصل کرو قیدِ نکاح میں لانے والے بن کر، نہ کہ آزاد شہوت رانی کرتے ہوئے) ۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ملکِ یمین میں آئی ہوئی عورتوں کو مہر دے کر نکاح میں لانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس کے بغیر ہی حلال ہیں۔
اِس معنی پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے:

قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلوتھم
خاشعون .... والذین ھم لفروجھم
حافظون الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم
فانھم غیر ملومین ٥

(فلاح پائی ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع برتتے ہیں ....
.... اور جو اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں سوائے اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں سے محفوظ نہ رکھنے پر وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں) ۔
اس آیت میں اہلِ ایمان کے لیے دو قسم کی عورتوں سے تعلقِ شہوانی کو

جائز ٹھیرایا گیا ہے۔ ایک ان کی ازواج۔ اور دوسرے مَا مَلَکَتْ اَیمَانُھُمْ ازواج سے مراد تو ظاہر ہے کہ منکوحہ بیویاں ہیں۔ اب اگر مَا مَلَکَتْ اَیمَانُھُمْ بھی منکوحہ بیویاں ہی ہوں تو ان کا ازواج سے الگ ذکر سراسر فضول ٹھیرتا ہے۔ لامحالہ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن سے محض ملکِ یمین کی بناپر تمتع جائز ہے۔

(ترجمان القرآن۔ شوال ۱۳۷۵ھ۔ جون ۱۹۵۶ء)

تعددِ ازواج اور لونڈیاں

سوال:۔

حسب ذیل آیت کی تفہیم کے لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس آیت میں چار بیویاں کرنے کی اجازت صرف اُس شخص کو ہے جو یتیم لڑکیوں کا ولی ہو اور اس امر کا اندیشہ ہو کہ وہ ان لڑکیوں کے متعلق انصاف نہ کر سکے گا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ بیویوں کے متعلق تو تعداد کی قید ہے کہ زیادہ سے زیادہ چار بیویاں کی جاسکتی ہیں۔ لیکن لونڈیوں کے ساتھ

تعلقات زن وشوئی قائم کرنے کے بارے میں ان کی تعداد کے متعلق کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ جنگ کے زمانے میں جو عورتیں پکڑی ہوئی آئیں گی اُن کی تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا، اس لیے لونڈیوں سے تمتع حاصل کرنے کے متعلق بھی تعداد کا تعین نہیں کیا گیا، تو میں یہ عرض کروں گا کہ بے شک یہ صحیح ہے اور اس لحاظ سے یہ تعین بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مسلمان کے حصہ میں کتنی لونڈیاں آئیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے حصہ میں دس آئیں اور دوسرے کے حصہ میں بیس۔ لیکن جہاں تک ان لونڈیوں سے تمتع کا تعلق ہے اس کا تعین تو بہرحال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص کے پاس لونڈیاں چاہے کتنی ہی ہوں وہ ان میں سے صرف ایک یا دو سے تمتع کر سکتا ہے، جیسا کہ بیویوں کی صورت میں تحدید ہے۔

اس آزادی کے ہوتے ہوئے ایک شخص نہ صرف یہ کہ مالِ غنیمت میں حصہ کے طور پہ بہت سی لونڈیاں حاصل کر سکتا ہے، بلکہ وہ ان کی جتنی تعداد چاہے خرید بھی سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک نفس پرست سرمایہ دار کے لیے کھلا ہوا موقع ہے کہ وہ جتنی لونڈیاں چاہے خریدے اور ہوس رانی کرتا رہے۔ لونڈیوں سے بلا تعینِ تعداد تمتع کرنے کی کھلی ہوئی اور عام اجازت دینے کی وجہ سے معاشرہ کے اندر وہی خرابی داخل ہو جاتی ہے جس کو اسلام نے زنا کہہ کر سخت سزا کا مستوجب

قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں یہی سبب تھا کہ جُوں جُوں مسلمانوں کی سلطنتیں وسیع ہوئیں اور ان کی دولت میں اضافہ ہوا، مسلم سوسائٹی میں رجم کی سزا کے جاری ہونے کے باوجود ہوس رانی بڑھتی گئی۔ کوئی قانون ایسا نہ تھا جو اس خرابی کا انسداد کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم خلفائے بنوامیّہ اور عباسیہ کے حرم میں لونڈیوں کے غول پھرتے دیکھتے ہیں اور پھر تاریخ میں اُن ذلیل سازشوں کا حال پڑھتے ہیں جو لونڈی غلاموں کے ذریعے پروان چڑھتی تھیں۔ پس میری رائے یہ ہے کہ اگر لونڈیوں سے تمتع کرنے کی اجازت بھی بہ تعینِ تعداد ہوتی تو مسلم معاشرہ میں وہ مفاسد اور نفس پرستیاں نہ پیدا ہوتیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ بہرحال ارشاد فرمائیے کہ شارع نے کن وجوہ و مصالح کی بنا پر لونڈیوں سے تمتع کی اجازت دیتے ہوئے تعداد کا تعین نہیں کیا؟

اسی ضمن میں ایک تیسرا سوال یہ بھی ہے کہ اگر لونڈی مشترکہ ہو تو کیا اس کے ساتھ تمتع جائز ہے؟

جواب:۔

آیت وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی پر تفصیل کے ساتھ

لہ اس طرح کے سوالات اور ان کے جوابات سے لوگ بسا اوقات یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید یہ مسائل حال یا مستقبل کے لیے زیر بحث آ رہے ہیں۔ حالانکہ دراصل ان

تفہیم القرآن میں نوٹ لکھ چکا ہوں۔ اس کے اعادے کی حاجت نہیں۔ آپ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ جہاں تک خود اس آیت کی تفسیر کا تعلق ہے، اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، اور صحابہ و تابعین سے منقول ہیں۔ مثلاً ایک معنی یہ بھی ہیں

سوالات کا تعلق اُس دور کے حالات سے ہے جب کہ دُنیا میں اسیرانِ جنگ کے تبادلہ کا طریقہ رائج نہ ہوا تھا اور فدیے پر سمجھوتہ کرنا بھی دشمن سلطنتوں کے لیے مشکل ہوتا تھا۔ آج ان مسائل پر بحث کرنے کی غرض یہ نہیں ہے کہ ہم اب لونڈیوں کی تجارت کا بازار کھولنا چاہتے ہیں بلکہ اس کی غرض یہ بتانا ہے کہ جس دور میں اسیرانِ جنگ کا تبادلہ اور فدیے کا معاملہ طے نہ ہو سکتا تھا اس زمانہ میں اسلام نے اس پیچیدہ مسئلہ کو کس طرح حل کیا تھا۔ نیز اس کی غرض ان اعتراضات کو رفع کرنا ہے جو ناواقف لوگوں کی طرف سے اسلام کے اس حل پر کیے جاتے ہیں۔ ہم نے جب کبھی اس مسئلے سے بحث کی ہے اسی غرض کے لیے کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فتنہ پرداز لوگ جان بوجھ کر اسے یہ معنی پہناتے ہیں کہ ہم آج اس زمانہ میں بھی غلامی ہی کے طریقے کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، خواہ اسیرانِ جنگ کا تبادلہ اور فدیہ ممکن ہو یا نہ ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس قسم کی باتیں کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کہتے ہیں، اور ہم ان سے اتنی حیاداری کی توقع بھی نہیں رکھتے کہ وہ ہماری اس تصریح کے بعد اپنی الزام تراشیوں سے باز آجائیں گے۔ تاہم یہ تصریح صرف اس لیے کی جا رہی ہے کہ جو لوگ ان کی باتوں سے کسی غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ یوں انصاف نہیں کر سکتے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جن کے شوہر مر چکے ہیں اور چھوٹے چھوٹے یتیم بچے چھوڑ کر گئے ہیں۔ یہ معنی اس لحاظ سے زیادہ بگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ یہ سورۃ جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھی اور اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے لیکن یہ بات کہ اسلام میں چار بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے، اور یہ کہ بیک وقت چار سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، اور یہ کہ اس فرمان کا کوئی تعلق یتامیٰ کے معاملہ سے نہیں ہے، محض اس آیت سے نہیں نکلتی بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قولی و عملی تشریح سے معلوم ہوتی ہے جو آپؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد فرمائی تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے ان لوگوں کو جن کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں تھیں حکم دے دیا کہ وہ صرف چار رکھ لیں اور اس سے زائد جس قدر بھی ہوں انہیں چھوڑ دیں۔ حالانکہ ان کے ہاں یتامیٰ کا کوئی معاملہ در پیش نہ تھا۔ نیز آپؐ کے عہد میں بکثرت صحابہ نے چار کی حد کے اندر متعدد نکاح کیے اور آپؐ نے کسی سے یہ نہ فرمایا کہ تمہارے لیے یتیم بچوں کی پرورش کا کوئی سوال نہیں ہے، اس لیے تم اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر صحابہؓ سے لے کر بعد کے ادوار تک امت کے تمام فقہاء نے یہ سمجھا کہ یہ آیت نکاح کے لیے بیک وقت چار کی حد مقرر کرتی ہے جس سے تجاوز جائز نہیں کیا جا سکتا، اور یہ کہ چار کی اجازت عام ہے، اس کے ساتھ یہ کوئی قید نہیں کہ یتامیٰ کا کوئی معاملہ بھی درمیان میں ہو۔ خود حضورؐ نے متعدد نکاح کیے اور کسی

میں یتیموں کے مسئلے کا دخل نہ تھا۔

لونڈیوں کے بارے میں آپ یہ جو تجویز پیش کرتے ہیں کہ ایک شخص کو لونڈیاں تو بلا قیدِ تعداد رکھنے کی اجازت ہوتی مگر تمتع کے لیے ایک یا دو کی حد مقرر کر دی جاتی، اس میں آپ نے صرف ایک ہی پہلو پہ نگاہ رکھی ہے، دوسرے پہلوؤں پہ غور نہیں فرمایا۔ تمتع کے لیے جو حد بھی مقرر کی جاتی اس سے زائد بچی ہوئی عورتوں کے مسئلہ کا کیا حل تھا؟ کیا یہ کہ وہ مرد کی صحبت سے مستقل طور پہ محروم کر دی جاتیں؟ یا یہ کہ انہیں گھر کے اندر اور اس کے باہر اپنی خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لیے ناجائز وسائل تلاش کرنے کی آزادی دے دی جاتی؟ یا یہ کہ ان کے نکاح لازماً دوسرے لوگوں سے کرنے پہ مالکوں کو از روئے قانون مجبور کیا جاتا اور قیدی عورتوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ڈالنے کے علاوہ ایک ذمہ داری ان پہ یہ بھی ڈال دی جاتی کہ وہ ان کے لیے ایسے شوہر تلاش کرتے پھریں جو لونڈیوں کو نکاح میں لینے پہ راضی ہوں؟

آپ کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ لونڈی سے تمتع کے لیے شریعت میں یہ قید نہیں ہے کہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہو۔ اور یہ قید عقل کی رُو سے بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مصلحتیں آدھی سے زیادہ فوت ہو جاتیں جن کی بنا پہ اسیرانِ جنگ کو (تبادلہ نہ ہو سکنے کی صورت میں) افراد کی ملکیت میں دینے کا طریقہ پسند کیا گیا تھا اور قیدی عورتوں سے ان کے مالکوں کو تمتع کی اجازت دی گئی تھی۔ کیونکہ اس صورت میں صرف وہ عورتیں مسلم

سوسائٹی کے اندر جذب کی جاسکتی تھیں جو کسی اہلِ کتاب قوم میں سے گرفتار ہو کر آئی ہوں۔ غیر اہلِ کتاب سے جنگ پیش آنے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے پھر یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا کہ ان میں سے جو عورتیں قید ہوں اُن کو دارالاسلام کے لیے فتنہ بننے سے کیسے بچایا جائے۔

(ترجمان القرآن۔ شوال ۱۳۷۵ھ۔ جون ۱۹۵۶ء)

تعدّدِ ازواج پر پابندی

سوال:-

میں آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر اسلامی ریاست میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہو تو کیا حکومت اس بنا پر تعددِ ازدواج پر پابندی عائد کر سکتی ہے؟

اس سوال کی ضرورت میں نے اس لیے محسوس کی ہے کہ میرا اندازہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں تعددِ ازواج کی اجازت دی ہے وہاں ہنگامی صورتِ حال پیش نظر تھی۔ اس زمانے میں سالہا سال کے مسلسل جہاد کے بعد بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں اور بچے بے آسرا اور یتیم رہ گئے تھے۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے یہ اجازت دی گئی تھی، تاکہ بیواؤں اور یتیم بچوں کو سوسائٹی میں جذب کیا جا سکے اور ان کی کفالت کی شائستہ صورت پیدا ہو سکے۔

جواب :-

آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد کا مردوں سے اتنا کم ہونا کہ اس سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو جائے ایک شاذ و نادر واقعہ ہے۔ عموماً تعداد مردوں ہی کی کم ہوتی رہتی ہے۔ عورتوں کی تعداد کم ہونے کے وجوہ وہ نہیں ہیں جو مردوں کی تعداد کم ہونے کے ہیں۔ عورتیں اگر کم ہوں گی تو اس وجہ سے کہ صنفِ اناث کی پیدائش ہی صنفِ ذکور سے کم ہو۔ اور ایسا ہونا اوّل تو شاذ و نادر ہے۔ اور اگر ہو بھی تو عورتوں کی اتنی کم پیدائش نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو اور اسے حل کرنے کے لیے قوانین کی ضرورت پیش آئے۔ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی شادی کے رواج سے یہ مسئلہ خود ہی حل ہو جاتا ہے۔

دوسری بات جو آپ نے لکھی ہے وہ قرآن کے صحیح مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کے کسی دَور میں بھی تعدّد ازدواج ممنوع نہ تھا، اور کوئی خاص وقت ایسا نہیں آیا کہ اس ممانعت کو کسی مصلحت کی بنا پہ رفع کر کے یہ فعل جائز کیا گیا ہو۔ دراصل تعدّد ازدواج ہر زمانے میں تمام انبیاء کی شریعتوں میں جائز رہا ہے اور عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں بھی یہ جائز اور رائج تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صحابۂ کرام بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِس پہ عامل تھے۔ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ اس آیت کے نزول سے پہلے تعدّد ازدواج ناجائز تھا اور اس آیت نے آکر اسے جائز کیا۔ آپ کے علم میں ایسی کوئی آیت ہو تو اس کا حوالہ دیں۔

سوال :-

آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کر دوں کہ آپ
کے جواب سے تشفی نہیں ہوئی ۔ میری گذارش صرف
اتنی تھی کہ اگر کسی معاشرے میں عورتوں کی تعداد
مردوں سے کم ہو جائے تو کیا اس صورت میں
حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک سے زیادہ
شادیوں پر پابندی عائد کر سکے ؟ آپ نے فرمایا ہے
کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے ۔ لیکن میرا سوال بھی
اسی شاذ صورتِ حال سے تعلق رکھتا ہے ۔ آپ کو
معلوم ہوگا کہ اس وقت پاکستان میں (مردم شماری کی رُو
سے) عورتیں مردوں کے مقابلے میں کم ہیں ۔ اب کیا حکومت
کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے کہ جب تک یہ صورتِ حال
قائم رہے، ایک سے زیادہ شادیوں کی ممانعت ہو
جائے !

میں نے عرض کیا تھا کہ تعددِ ازدواج کی اجازت کا مطلب
غالباً یہ ہے کہ اس زمانے میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
دعوتِ حق میں مصروف تھے ، تو سالہا سال کے جہاد کی
وجہ سے بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا مسئلہ حل کرنا پڑا ،
اور اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ ایک سے زیادہ شادیوں

کی اجازت دے دی جائے ۔ جس مقام پہ اجازت دی گئی ہے اس سے قبل جہاد و قتال ہی کا ذکر آیا ہے ۔ اس طرح میں نے غلط یا صحیح طور پہ یہ استنباط کیا ہے کہ یہ اجازت مخصوص حالات کے لیے ہی ہو سکتی ہے ۔ اگر یہ استنباط غلط بھی ہے اور جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن کے صحیح مطالعہ پہ مبنی نہیں تو اس سے ہٹ کر بھی یہی کچھ سوچا جا سکتا ہے کہ دو دو، تین تین اور چار چار نکاح اسی صورت میں کیے جا سکتے ہیں، جبکہ معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہو ۔ اگر ان کی تعداد مقابلتہً زیادہ نہ ہو یا مردوں کے مساوی ہو، تو اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے ؟

جواب :-

پاکستان کی مردم شماری میں عورتوں کی تعداد کا مردوں سے کم پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ فی الواقع ہمارے ہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہے ۔ بلکہ اس میں ہمارے ہاں کے رسم و رواج کا بڑا دخل ہے جس کی بنا پہ لوگ اپنے گھر کی عورتوں کا اندراج کرانے سے پرہیز کرتے ہیں ۔ تاہم اگر کروڑوں کی آبادی میں چند لاکھ کا فرق ہو بھی تو اس سے کوئی ایسا معاشرتی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا جس کے لیے تعددِ ازدواج پہ پابندی عائد کرنے کی ضرورت پیش آئے ۔ یہ مسئلہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے نکاح ثانی سے حل ہو جاتا ہے اور بالفرض اگر کوئی بہت ہی غیر معمولی کمی واقع ہو جائے تو عارضی طور پہ کچھ مدت کے

لیے پابندی عائد کرنا بھی جائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس پابندی کا اصل محرک یہی مسئلہ ہو۔ لیکن اس بات کو چھپانے کی آخر کیا ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت دراصل اس بناء پر محسوس نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کا محرک یہ مغربی تخیل ہے کہ تعدد ازدواج بجائے خود ایک برائی ہے اور از روئے قانون یک زوجی ہی کو رواج مطلوب ہے۔ یہ محرک ہمارے نزدیک سخت قابلِ اعتراض ہے اور اس کی جڑ کاٹنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کوئی آیت تعدد ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی ہے۔ تعدد ازدواج پہلے سے جائز چلا آرہا تھا اور سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کے نزول سے پہلے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تین ازواج مطہرات موجود تھیں۔ نیز صحابہ کرام میں بھی بہت سے اصحاب تھے جن کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ سورۂ نساء کی مذکورہ آیت اس جائز فعل کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ اس غرض کے لیے آئی تھی کہ جنگِ اُحد میں بہت سے صحابہ کے شہید ہو جانے اور بہت سے بچوں کے یتیم ہو جانے سے فوری طور پر جو معاشرتی مسئلہ پیدا ہوا تھا اسے حل کرنے کی صورت مسلمانوں کو یہ بتائی گئی کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کر کے ان یتیموں کو اپنی سرپرستی میں لے لو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعدد ازدواج صرف ایسے ہی مسائل پیش آنے کی صورت میں جائز ہے۔ آخر تیرہ چودہ سو برس سے ہمارے معاشرے میں یہ طریقہ رائج ہے۔ اس سے پہلے کب یہ سوال پیدا ہوا تھا

کہ تعددِ ازدواج کی اجازت مخصوص حالات کے ساتھ مشروط ہے؟ یہ طرزِ فکر تو ہمارے ہاں مغرب کے غلبے سے پیدا ہوا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۶۳ء)

توام متحد الجسم لڑکیوں کا نکاح

(ذیل میں جس سوال کا جواب درج کیا جا رہا ہے اس کی بنیاد پہ کئی سال سے ایک گروہ مصنف کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ اس نے جمع بین الاختین کو حلال کر دیا ہے۔ اب ہر شخص اِسے خود پڑھ کر رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس افتراء کی حقیقت کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ دو بھائیوں یا دو بہنوں کا متحد الجسم ہونا کوئی ناممکن واقعہ نہیں ہے۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں سیام کے متحد الجسم بھائیوں کا قصہ ملاحظہ فرما لیا جائے)

سوال:-

مندرجہ ذیل سطور بغرض جواب ارسال ہیں۔ کسی ملاقاتی کے ذریعے بھیج کر ممنون فرمائیں۔

بہاولپور میں دو توام لڑکیاں متحد الجسم ہیں۔ یعنی جس وقت وہ پیدا ہوئیں تو ان کے کندھے، پہلو، کولہے کی ہڈی تک آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اور کسی طرح سے ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا

تھا۔ اپنی پیدائش سے اب جوان ہونے تک وہ ایک ساتھ چلتی پھرتی ہیں۔ ان کو بھوک ایک ہی وقت لگتی ہے۔ پیشاب پاخانہ کی حاجت ایک ہی وقت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو کوئی عارضہ لاحق ہو تو دوسری بھی اسی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اُن کا نکاح ایک مرد سے ہو سکتا ہے یا نہیں۔ نیز اگر دونوں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں آسکتی ہیں تو اس کے لیے شرعی دلیل کیا ہے؟

مقامی علماء نہ ایک مرد سے نکاح کی اجازت دیتے ہیں اور نہ دو سے۔ ایک مرد سے ان دونوں کا نکاح قرآن کی اس آیت کی رُو سے درست نہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ دو حقیقی بہنیں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَاقَدْ سَلَفَ ؕ اس حکم کو بنیاد بنا کر اگر دو مردوں کے نکاح میں ان دو متحد الجسم عورتوں کو دے دیا گیا تو مندرجہ ذیل دشواریاں ایسی ہیں جن کو دیکھ کر علماء نے سکوت اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایک مرد اپنی منکوحہ نامزد بیوی تک ہی اپنے صنفی تعلقات کو محدود کر سکے گا اور دوسری متحد الجسم عورت سے جو اس کے نکاح میں نہیں ہے تعرض نہ کرے گا۔

۲۔ یہ دوسری عورت جو اپنی بہن سے متحد الجسم ہونے کے ساتھ متحد المزاج بھی ہے زوجی تعلق کے وقت متاثر نہ ہوگی۔

۳۔ دو مردوں سے ایسا نکاح جس میں دونوں عورتیں رصنفی تعلقات

کے وقت) متاثر ہوتی ہوں، ان کی حیا مجروح ہوتی ہو، ان میں قبیحانہ جذبات پیدا ہوتے ہوں، کیا نکاح اس روح کے منافی نہیں جس میں بتایا گیا ہے۔ وجعل بینکم مودۃ (الروم) وجعل منہا لیسکن الیہا (اعراف)

۴۔ نکاح کا ایک بڑا مقصد افزائش نسل ہے اور والدین اور مولود میں شفقت بھی ہے۔ دو مردوں کا یہ نکاح اس تعلق پہ کلہاڑا چلاتا ہے۔ اور بھی مفاسد ہیں جن کے بیان کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

براہ کرم شریعت کی روشنی میں اس سوال کو حل کیجیے تاکہ یہ تذبذب دور ہو۔ ان عورتوں کے والدین ان کا نکاح کر سکیں۔ اور اس فتنہ کا سد باب ہو۔ جو جوان ہونے کی وجہ سے ان کو لاحق ہے۔

جواب:۔

ان دونوں لڑکیوں کے معاملے میں چار صورتیں ممکن ہیں،

ایک یہ کہ دونوں کا نکاح دو الگ شخصوں سے ہو۔

دوسری یہ کہ ان میں کسی ایک کا نکاح ایک شخص سے کیا جائے اور دوسری محروم رکھی جائے۔

تیسری یہ کہ دونوں کا نکاح ایک ہی شخص سے کر دیا جائے۔

چوتھی یہ کہ دونوں ہمیشہ نکاح سے محروم رکھی جائے۔

ان میں سے پہلی دو صورتیں تو ایسی صریح ناجائز، غیر معقول اور ناقابل عمل ہیں کہ ان کے خلاف کسی استدلال کی حاجت نہیں۔ اب رہ جاتی ہیں آخری دو

صورتیں۔ یہ دونوں قابلِ عمل ہیں۔ مگر ایک صورت کے متعلق مقامی علماء کہتے ہیں کہ یہ چونکہ جمع بین الاختین کی صورت ہے جسے قرآن میں حرام قرار دیا گیا ہے، اس لیے لامحالہ آخری صورت پر ہی عمل کرنا ہوگا۔ بظاہر علماء کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ دونوں لڑکیاں توام بہنیں ہیں اور قرآن کا یہ حکم صاف اور صریح ہے کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ لیکن اس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ان لڑکیوں کو دائمی تجرد پر مجبور کیا جائے اور یہ ہمیشہ کے لیے نکاح سے محروم رہیں؟ اور کیا قرآن کا یہ حکم واقعی اس مخصوص اور نادر صورتِ حال کے لیے ہے جس میں یہ دونوں لڑکیاں پیدائشی طور پر مبتلا ہیں؟

میرا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس مخصوص حالت کے لیے نہیں ہے بلکہ اس عام حالت کے لیے ہے جس میں دو بہنوں کے الگ الگ مستقل وجود ہوتے ہیں، اور وہ ایک شخص کے جمع کرنے سے ہی بیک وقت ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ عام حالات کے لیے حکم بیان کرتا ہے۔ اور مخصوص، شاذ اور نادر الوقوع یا عسیر الوقوع حالات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح کے حالات سے اگر سابقہ پیش آجائے تو تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ عام حکم کو ان پر جوں کا توں چسپاں کرنے کے بجائے صورتِ حکم کو چھوڑ کر مقصدِ حکم کو مناسب طریقے سے پورا کیا جائے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ شارع نے روزے کے لیے بہ الفاظِ صریح یہ حکم دیا ہے کہ طلوعِ فجر کے ساتھ اس کو شروع کیا جائے اور رات کا آغاز ہوتے ہی

افطار کر لیا جائے۔ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ یہ حکم زمین کے اُن علاقوں کے لیے جن میں رات کا اُلٹ پھیر چوبیس گھنٹوں کے اندر پورا ہو جاتا ہے۔ اور حکم کو اس شکل میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی آبادی کا بیشتر حصّہ انہی علاقوں میں رہتا ہے۔ اب ایک شخص سخت غلطی کرے گا اگر اس حکم کو اُن مخصوص حالات پر جُوں کا تُوں چسپاں کر دے گا جو قطبِ شمالی کے قریب علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں رات اور دن کا طول کئی کئی مہینوں تک ممتد ہو جاتا ہے۔ ایسے علاقوں کے لیے یہ کہنا کہ وہاں بھی طلوعِ فجر کے ساتھ شروع کیا جائے اور رات آنے پر کھولا جائے، یا یہ کہ وہاں سرے سے روزہ رکھا ہی نہ جائے، کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ تفقہ کا یہ تقاضا ہے کہ ایسے مقامات پر صورتِ حکم کو چھوڑ کر کسی دوسری مناسب صورت سے حکم کا منشا پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ روزوں کے لیے ایسے اوقات مقرر کر لیے جائیں جو زمین کی بیشتر آبادی کے اوقاتِ صوم سے ملتے جلتے ہوں۔

یہی صورت میرے نزدیک ان دو لڑکیوں کے معاملہ میں بھی اختیار کرنی چاہیے جن کے جسم آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے نکاح دو الگ شخصوں سے کرنے یا سرے سے نکاح ہی نہ کرنے کی تجویزیں غلط ہیں۔ ان کی بجائے ہونا یہ چاہیے کہ ان تجمعوا بین الاختین کے ظاہر کو چھوڑ کر صرف اس کے منشا کو پورا کیا جائے۔ حکم کا منشا یہ ہے کہ دو بہنوں کو سوکناپے کی

رقابت میں مبتلا کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہاں چونکہ ایسی صورت حال درپیش ہے کہ دونوں کا نکاح یا تو ایک ہی شخص سے ہو سکتا ہے یا پھر کسی سے نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ فیصلہ انہی دونوں بہنوں پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جانے پر راضی ہیں یا دائمی تجرّد کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر وہ پہلی صورت کو خود قبول کر لیں تو ان کا نکاح کسی ایسے شخص سے کر دیا جائے جو انہیں پسند کرے۔ اور اگر وہ دوسری صورت ہی کو ترجیح دیں تو پھر اس ظلم کی ذمّہ داری سے ہم بھی بری ہیں اور خدا کا قانون بھی۔

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بالفرض یہ دونوں ایک شخص کے نکاح میں دے دی جائیں، اور بعد میں وہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دے دے تو کیا ہوگا میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں دونوں اس سے جدا ہو جائیں گی۔ ایک اس لیے کہ اسے طلاق دی گئی اور دوسری اس لیے کہ وہ اس سے کوئی تمتع نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ خلوتِ اجنبیہ کے جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے اپنے گھر پر بھی نہیں رکھ سکتا، کیونکہ مطلّقہ لڑکی کو اپنے گھر رہنے پر مجبور کرنے کا اسے حق نہیں ہے۔ اور غیر مطلّقہ لڑکی بھی اس کے ساتھ نہ ہو۔ لہٰذا جب وہ ان میں سے ایک کو طلاق دے گا تو دوسری کو خلع کے مطالبے کا جائز حق حاصل ہو جائے گا۔ اگر وہ خلع نہ کرے تو عدالت کا فرض ہے کہ اسے خلع پر مجبور کرے۔ یہ لڑکیاں پیدائش ہی کی وجہ سے ایسی ہیں کہ کوئی شخص نہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی ایک کو طلاق دے سکتا ہے۔ ان کا نکاح بھی ایک ساتھ ہوگا اور طلاق بھی۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم

بالصواب۔

(ترجمان القرآن۔ صفر ۱۳۷۴ھ۔ نومبر ۱۹۵۴ء)

طلاق قبل از نکاح

سوال:۔

میرے ایک غیر شادی شدہ دوست نے کسی وقتی جذبے کے تحت ایک مرتبہ یہ کہہ دیا تھا کہ "اگر میں کسی عورت سے بھی شادی کروں تو اس پر تین طلاق ہے"۔ اب وہ اس قول پر سخت نادم ہے اور چاہتا ہے کہ شادی کرے۔ علماء یہ کہتے ہیں کہ جونہی وہ شادی کرے گا عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس لیے عمر بھر اب شادی کی کوشش کرنا اس کے لیے ایک بے کار اور عبث فعل ہے۔ براہِ کرم بتائیں کہ اس مصیبت خیز الجھن سے نکلنے کا کوئی رستہ ہے یا نہیں؟

جواب:

بلاشبہ فقہائے حنفیہ کی رائے یہی ہے کہ ایسی صورت میں جس عورت سے بھی اس کا نکاح ہو گا اس پر طلاق وارد ہو جائے گی۔ لیکن تمام ائمہ وفقہاء کا اس بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ طلاق کا حق نکاح کے بعد پیدا ہوتا ہے نہ کہ نکاح سے پہلے۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا ہو کہ وہ آئندہ جس عورت سے بھی نکاح کرے اس کو طلاق ہے تو یہ لغو اور

غیر موثر بات ہے۔ اس سے کوئی قانونی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ یہی رائے حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی منقول ہے۔ اور اس رائے کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ لا طلاق الا من بعد نکاح (طلاق نہیں ہے مگر نکاح کے بعد)

امام مالکؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی خاص عورت یا خاص قبیلے یا خاص خاندان کی عورتوں کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے تب تو طلاق لازم آجائے گی، لیکن مطلقاً تمام عورتوں کے بارے میں یہ بات کہی جائے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ پہلی صورت میں تو یہ امکان باقی رہتا ہے کہ مرد اس عورت یا اُس قبیلے کی عورت کے سوا دوسری عورتوں سے نکاح کر سکے۔ لیکن دوسری صورت میں ترک سنت کی قباحت لازم آتی ہے۔ اور یہ ایک حلال چیز کو اپنے اوپر مطلقاً حرام کر لینے کا ہم معنی ہے۔

اِس مسئلے پر مزید تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ احزاب صفحہ ۷۳۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ۔ جنوری ۱۹۵۶ء)

عدتِ خلع

سوال:۔

آپ کی تصنیف "تفہیم القرآن" جلد اوّل سورہ بقرہ صفحہ ۱۷۶ میں لکھا ہوا ہے کہ "خلع کی صورت میں عدت صرف حیض ہے ہے۔ دراصل

یہ عدت سے ہی نہیں بلکہ یہ حکم محض استبراء رحم کے لیے دیا گیا ہے" الخ
اب قابلِ دریافت یہ امر ہے کہ آپ نے اس مسئلہ کی سند وغیرہ نہیں لکھی۔ حالانکہ یہ قول مفہوم الآیہ اور اقوالِ محققین اور قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی خلاف ہے۔

(۱) فی الفتح، روی عبدالرزاق مرفوعاً الخلع تطلیقۃ۔

(۲) وروی الدارقطنی وابن عدی انہ جعل النبی الخلع تطلیقۃ۔

(۳) وروی مالک عن ابن عمرؓ عدۃ المختلعۃ عدۃ المطلقۃ۔

ایک ابوداؤد کی روایت ہے کہ عدتہ حیضۃ، لیکن یہ قول تصرف من الرواۃ پر محمول کیا گیا ہے اور نص کے بھی خلاف ہے کہ نص میں ہے وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ۔ مہربانی فرما کر احادیث نبویہ میں تطبیق دیتے ہوئے اپنے اطلاق پر رکھتے ہوئے اور محدثین کے اقوال کو دیکھتے ہوئے مسئلہ کی پوری تحقیق مدلل بحوالہ کتب معتبرہ تحریر فرمائیں تاکہ باعثِ اطمینان ہوسکے۔

جواب:

مختلعہ کی عدت کے مسئلے میں اختلاف ہے۔ فقہاء کی ایک جماعت اسے مطلقہ کی عدت کے مانند قرار دیتی ہے۔ اور ایک معتدبہ جماعت اسے

ایک حیض تک محدود رکھتی ہے۔ اس دوسرے مسلک کی تائید میں متعدد احادیث ہیں۔ نسائی اور طبرانی نے ربیع بنت معوذ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ثابت ابن قیس کی بیوی کے مقدمۂ خلع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

ان تتربص حیضۃ واحدۃ وتلحق باھلھا۔

ابوداؤد اور ترمذی نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انہی زوجۂ ثابت بن قیس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ تعتد بحیضۃ۔

نیز ترمذی، نسائی اور ابنِ ماجہ نے ربیع بنت معوذ کی ایک اور روایت بھی اسی مضمون کی نقل کی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن عمرؓ کے حوالہ سے حضرت عثمانؓ کا بھی ایک فیصلہ اسی مضمون پر مشتمل نقل کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے ابن عمرؓ مختلعہ کی عدت کے معاملہ میں تین حیض کے قائل تھے، حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ کے بعد انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور ایک حیض کا فتویٰ دینے لگے۔ اسی طرح ابن ابی شیبہ نے ابن عباسؓ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ عدتھا حیضۃ۔ ابنِ ماجہ نے ربیع بنت معوذ بن عفراء کے حوالہ سے حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا فیصلہ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں حضرت عثمانؓ کا یہ قول بھی موجود ہے کہ انما اتبع

فی ذالک قضاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

امید ہے کہ ان حوالوں سے آپ کا اطمینان ہو جائے گا۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۱۳۷۶ھ۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

ضبطِ ولادت

سوال :-

آج کل ضبطِ ولادت کو خاندانی منصوبہ بندی کے عنوانِ جدید کے تحت مقبول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے حق معاشی دلائل کے علاوہ بعض لوگوں کی طرف سے مذہبی دلائل بھی فراہم کیے جارہے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جارہا ہے کہ حدیث میں عزل کی اجازت ہے اور برتھ کنٹرول کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اب حکومت کی طرف سے مردوں کو بانجھ بنانے کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جارہی ہیں۔ چنانچہ بعض ایسے ٹیکے ایجاد ہورہے ہیں جن سے مرد کا جوہرِ حیات اس قابل نہیں رہتا کہ وہ افزائشِ نسل کا ذریعہ بن سکے لیکن جنسی لذت برقرار رہتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ طریقہ بھی شرعاً قابلِ اعتراض نہیں، اور نہ یہ قتلِ اولاد یا اسقاطِ حمل ہی کے ضمن میں آسکتا ہے۔

براہِ کرم اس بارے میں بتائیں کہ آپ کے نزدیک اسلام اِس طرزِ عمل کی اجازت دیتا ہے یا نہیں ؟

جواب :-

ضبطِ ولادت کے موضوع پر میں اب سے کئی سال پہلے ایک کتاب "اسلام اور ضبطِ ولادت" لکھ چکا ہوں جس میں دینی، معاشی اور معاشرتی

نقطۂ نظر سے اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر بحث موجود ہے۔ اب اس کا جدید ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔

آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ عزل کے متعلق جو کچھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور اس کے جواب میں جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا اس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا۔ ضبطِ ولادت کی کوئی عام دعوت و تحریک ہرگز پیش نظر نہ تھی۔ نہ ایسی کسی تحریک کا مخصوص فلسفہ تھا جو عوام میں پھیلایا جا رہا ہو، نہ ایسی تدابیر وسیع پیمانے پر ہر مرد و عورت کو بتائی جا رہی تھیں کہ وہ باہم مباشرت کرنے کے باوجود استقرارِ حمل کو روک سکیں، اور نہ حمل کو روکنے والی دوائیں اور آلات ہر کس و ناکس کی دسترس تک پہنچائے جا رہے تھے۔ عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔

اس طرح کے جو جوابات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا بھی ہے تو وہ ہرگز ضبطِ ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحیت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔ ایسی کوئی تحریک اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اس کے خلاف ویسا ہی جہاد کرتے جیسا

شرک و بدعت و پرستی کے خلاف آپؐ نے کیا۔ میں ہر اس شخص کو جو عزل سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا غلط استعمال کرکے انہیں موجودہ تحریک کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے خدا سے ڈرتا ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اس جسارت سے باز رہے۔ مغرب کی بے خدا تہذیب و فکر کی پیروی اگر کسی کو کرنی ہو تو سیدھی طرح اسے دینِ مغرب سمجھ کر ہی اختیار کرے۔ آخر وہ اسے عین خدا و رسول کی تعلیم قرار دے کر خدا کا مزید غضب مول لینے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

اسلام جس طرح ضبطِ ولادت کی عمومی تحریک کو روا نہیں رکھتا، اسی طرح وہ قصداً بانجھ بننے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ یہ کہنا کہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو بانجھ کر لینا کوئی ناجائز کام نہیں ہے، اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا غلط ہے کہ آدمی کا خودکشی کر لینا جائز ہے۔ دراصل اس طرح کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے نزدیک آدمی اپنے جسم اور اپنی قوتوں کا خود مالک ہے اور اپنے جسم اور اس کی قوتوں کا خود مالک ہے اور اپنے جسم اور اس کی قوتوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرنا چاہے کر لینے کا حق رکھتا ہے۔ اسی غلط خیال کی وجہ سے جاپانی خودکشی کو جائز سمجھتے ہیں۔ اسی غلط خیال کی وجہ سے بعض جوگی اپنے ہاتھ یا پاؤں یا زبان بیکار کر لیتے ہیں۔ لیکن جو شخص اپنے آپ کو خدا کا مملوک سمجھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ یہ جسم اور اس کی قوتیں خدا کا عطیہ اور اس کی امانت ہیں اس کے نزدیک اپنے آپ کو بانجھ کر لینا ویسا ہی گناہ ہے جیسا کسی دوسرے انسان کو زبردستی بانجھ کر دینا یا کسی کی بینائی ضائع کر دینا گناہ ہے۔

(ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

ضبطِ ولادت اور وصیۃ العینین

سوال :

دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے آج اسلام کیا حل پیش کرتا ہے؟ برتھ کنٹرول (پیدائش روکنے) کے لیے دواؤں کا استعمال، فیملی پلاننگ وغیرہ کو کیا آج بھی غیر شرعی قرار دے کر ممنوع قرار دیا جائے گا؟ کیا ایک مسلمان زندگی میں اپنی آنکھیں عطیہ کر سکتا ہے کہ موت کے بعد کسی مریض کے لیے استعمال ہو سکیں؟ کیا یہ قربانی گناہ تو نہ ہوگی اور قیامت میں یہ شخص اندھا تو نہ اٹھے گا؟

جواب :-

دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اسلام صرف ایک ہی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے رزق کے جو ذرائع پیدا کیے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جو ذرائع اب تک مخفی ہیں ان کو دریافت کرنے کی پیہم سعی کی جاتی رہے۔ آبادی روکنے کی ہر کوشش خواہ وہ قتلِ اولاد ہو یا اسقاطِ حمل یا منعِ حمل، غلط اور بے حد تباہ کن ہے۔ ضبطِ ولادت کی تحریک کے چار نتائج ایسے ہیں جن کو رونما ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جا سکتا۔

١۔ زنا کی کثرت۔

٢۔ انسان کے اندر خود غرضی اور اپنا معیارِ زندگی بڑھانے کی خواہش کا اس

حد تک ترقی کر جاتا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اپنے یتیم بھائیوں اور اپنے دوسرے محتاجِ امداد رشتہ داروں کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگے۔ کیونکہ جو آدمی اپنی روٹی میں خود اپنی اولاد کو شریک کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ دوسروں کو بھلا کیسے شریک کر سکے گا؟

۳۔ آبادی کے اضافے کا کم سے کم مطلوب معیار بھی جو ایک قوم کو زندہ رکھنے کے لیے ناگزیر ہے برقرار نہ رہنا۔ اس لیے کہ جب یہ فیصلہ کرنے والے افراد ہوں گے کہ وہ کتنے بچے پیدا کریں اور کتنے نہ کریں، اور اس فیصلہ کا مدار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو نئے بچوں کی آمد کی وجہ سے گرنے نہ دیں، تو بالآخر وہ اتنے بچے بھی پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے جتنے ایک قوم کو اپنی قومی آبادی برقرار رکھنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں کبھی کبھی نوبت یہ بھی آجاتی ہے کہ شرحِ پیدائش شرحِ اموات سے کم تر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ فرانس دیکھ چکا ہے، حتیٰ کہ اس کو "بچے زیادہ پیدا کرو" کی تحریک چلانی پڑی اور انعامات کے ذریعہ سے اس کی ہمت افزائی کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

۴۔ قومی دفاع کا کمزور ہو جانا۔ یہ نتیجہ خصوصی طور پر ایک ایسی قوم کے لیے بے حد خطرناک ہے جو اپنے سے کئی گنی زیادہ دشمن آبادی میں گھری ہوئی ہے پاکستان کے تعلقات ہندوستان اور افغانستان کے ساتھ جیسے کچھ ہیں سب کو معلوم ہے۔ اور امریکہ کی دوستی نے کمیونسٹ ممالک سے بھی اس کے تعلقات خراب کر دیئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان، چین، روس اور

افغانستان کی آبادی ہم سے تیرہ گنی ہے۔ اِن حالات میں لڑنے کے قابل افراد کی تعداد گھٹانا جیسی عقل مندی ہے اسے ایک صاحب عقل آدمی خود سوچ سکتا ہے۔

آنکھوں کے عطیے کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آسکتے ہیں اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھول دیا جائے تو مسلمان کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہو کر رہے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے۔ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندہ میں دینے کی وصیت کر دے۔ جسم اس وقت تک اس کے تصرف میں ہے جب تک وہ اس جسم میں خود رہتا ہے۔ اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس معاملے میں اس کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رُو سے یہ زندہ انسانوں کا فرض ہے کہ اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حُرمت کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مُردہ انسانوں کے بعض کار آمد اجزا زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے (جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم نمبر ۲ کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے) انسانی کھال کو اُتار کر اس کو دباغت دینے کی کوشش

کی جائے گی تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس، یا منی پرس بنائے جا سکیں۔ (چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدارس کی ایک ٹینری کر چکی ہے)۔ انسان کی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی، حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس دورِ وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مُردہ انسان کے اعضا نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اسی جسم کے دوسرے "مفید" استعمالات کو روک سکیں گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۶۲ء)

کفارۂ جرم اور مسئلہ کفارت

سوال:۔

کیا اگر کسی گناہ (مثلاً زنا) کی شرعی سزا ایک شخص کو اسلامی حکومت کی جانب سے مل جائے تو وہ آخرت میں اس گناہ کی سزا سے بری ہو جائے گا یا کہ نہیں؟

(۲) کیا حدیث یا قرآن میں کوئی اصولی ہدایت اس امر کی موجود ہے کہ ہر شخص اپنی قوم (ذات) میں ہی شادی کرے۔ واضح رہے کہ میں کفادت کا اس معنی میں تو قائل ہوں کہ فریقین میں مناسبت

ہونی چاہیے، غیر ضروری معیار کا فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

جواب :۔

(۱) شرعی سزا جاری ہونے کے بعد آخرت میں آدمی کی معافی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ آدمی نے اس کے ساتھ خدا سے توبہ بھی کی ہو اور اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہو۔ لیکن اگر بالفرض ایک شخص نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا گیا، مگر اس نے اپنے گناہ پر اپنے خدا کے سامنے کوئی فیصلہ نہ کیا، بلکہ الٹا دل میں اس شریعت ہی کو کوستا رہا جس نے اس کا ہاتھ کٹوایا ہے، تو خدا کے ہاں اس کے معاف کر دیئے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۲) قرآن یا حدیث میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی قوم میں ہی شادی کرے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا عمل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۶۱ء)

عائلی قوانین اور قانونِ شریعت

سوال :۔

کیا عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد کوئی شخص اگر شریعت کے مطابق کسی قسم کی طلاق دے تو وہ واقع ہو جائے گی؟ متذکرہ

صدر قوانین کی رُو سے تو طلاق کے نافذ ہونے کے لیے کچھ خاص شرائط عائد کر دی گئی ہیں۔

جواب :۔

کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔ اس لیے جو طلاق شرعی قواعد کی رُو سے دے دی گئی ہو وہ عند اللہ اور عند المسلمین نافذ ہو جائے گی خواہ ان قوانین کی رُو سے وہ نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً قابلِ نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہو گی خواہ یہ قوانین اس کو نافذ قرار دیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیے کہ وہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق طے کرنا چاہتے ہیں یا ان عائلی قوانین کے مطابق۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۶۲ء)

منکوحہ کتابیہ کے لیے آزادیٔ عمل کے حدود

اہلِ کتاب کی جن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے ان کے بارے میں قرآن مجید دو شرطیں لگاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ محصنات (پاک دامن) ہوں، دوسرے یہ کہ ان سے نکاح کر کے ایک مسلمان خود اپنے ایمان کو خطرے میں نہ ڈال بیٹھے (ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ آیت ۵) ان شرائط کی رُو سے فاسق و فاجر کتابیات کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنا

کا فرض ہے کہ جس عورت سے وہ شادی کر رہا ہے وہ اس گھر میں، اس کے خاندان میں، اور اس کے بچوں میں ایسے افعال رائج کرنے کی موجب نہ بنے جو اسلام میں حرام ہیں بلاشبہ وہ اسے مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کو چرچ جانے سے نہیں روک سکتا۔ مگر اسے شادی سے پہلے ہی یہ شرط کر لینی چاہیئے کہ وہ اس کی زوجیت میں آنے کے بعد شراب، سؤر کے گوشت اور دوسری حرام چیزوں سے اجتناب کرے گی۔ ایسی شرط پہلے ہی طے کر لینے کا اسے حق بھی ہے اور ایسا کرنا اس کا فرض بھی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں سخت تساہل کرنے والا آدمی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کی اپنی اولاد ان حرام افعال میں مبتلا ہو (اور ظاہر ہے کہ اولاد کا ماں سے متاثر نہ ہونا متوقع نہیں ہو سکتا)، تو اس کی ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہوگا۔

نکاح بلا مہر

نکاح بِلا مہر ہو سکتا ہے، لیکن اسلامی فقہ کی رُو سے اس طرح کے نکاح میں مہر مثل آپ سے آپ لازم آجاتا ہے۔

اللہ کے حقوق اور والدین کے حقوق

سوال:۔

میں ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہوں اور آپ کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں جماعت کا ہمہ وقتی کارکن ہوں اور اس وجہ سے گھر سے دور رہنے پر مجبور ہوں۔ والدین کا شدید اصرار ہے کہ میں ان کے پاس رہ کر تجارتی کاروبار شروع کر دوں۔ وہ مجھے بار بار خطوط لکھتے رہتے ہیں کہ تم والدین کے حقوق کو نظر انداز کر رہے ہو۔ میں اس بارے میں ہمیشہ متشوش رہتا ہوں۔ ایک طرف مجھے والدین کے حقوق کا بہت احساس ہے، دوسری طرف میں محسوس کرتا ہوں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے میرا جماعت کا کارکن بن کر رہنا ضروری ہے۔ آپ اس معاملے میں مجھے صحیح مشورہ دیں تاکہ میں افراط و تفریط سے بچ سکوں یہ بھی معلوم ہے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے گھر میں میری زندگی سخت تکلیف کی ہو گی۔ لیکن شرعاً اگر ان کا مطالبہ واجب التعمیل ہے تو پھر بہتر ہے کہ میں اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کر لوں میرے والد صاحب میری ہر بات کو موردِ اعتراض بنا لیتے ہیں اور میری طرف سے اگر بہت ہی نرمی کے ساتھ جواب عرض کیا جائے تو اسے بھی سننا گوارا نہیں فرماتے۔

جواب :-

والدین کی اطاعت اور دین کی خدمت کے درمیان توازن کا مسئلہ بالعموم اُن سب نوجوانوں کے لیے وجہ پریشانی بنا رہتا ہے جن کے والدین جماعتِ اسلامی اور اس کے مقصد سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ میں نے عموماً یہ دیکھا ہے کہ ایک بیٹا اگر سرکاری ملازمت میں ہو یا کسی اچھے کاروبار میں لگا ہوا ہو تو والدین اس کے ہزاروں میل دور رہنے کو بھی برداشت کر لیتے ہیں اور اس سے کبھی نہیں کہتے کہ تو ملازمت یا روزگار چھوڑ دے اور آکر ہماری خدمت کر۔ بیٹے کے اطوار اگر فاسقانہ بھی ہوں تو اعتراض کی زبان کھولنے کی ضرورت انہیں بالعموم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اپنے سارے حقوق انہیں صرف اسی وقت یاد آجاتے ہیں جب کوئی بیٹا اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے حتیٰ کہ اگر جماعت اسے معقول معاوضہ دے تب بھی وہ یہی ضد کرتے ہیں کہ بیٹا گھر میں بیٹھ کر اُن کے "حقوق" ادا کرے۔ بلکہ حقوق ادا کرنے پر بھی ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوتا، اس کی ہر بات انہیں کھٹکتی ہے اور اس کی کسی خدمت سے بھی وہ خوش نہیں ہوتے۔ یہ صورتِ حال میں ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور جماعت کے بکثرت نوجوانوں کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کرنا پڑ رہا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے ہاں فی الواقع کیا صورتِ حال ہے۔ اگر وہی کچھ ہے جو آپ کے بیان سے سمجھ میں آرہی ہے تو یہ آپ کے والدین کی زیادتی

ہے۔ آپ جہاں کام کر رہے ہیں وہیں کرتے رہیں۔ جو کچھ مالی خدمت آپ کے بس میں ہو وہ بھی کرتے رہیں بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنی مقدرت سے کچھ زیادہ ہی بھیجتے رہیں۔ اور حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً ان کے پاس ہو آیا کریں۔ لیکن اگر صورتِ حال اس سے مختلف ہو اور فی الواقع آپ کے والدین اس بات کے محتاج ہوں کہ آپ کے لیے اُن کے پاس رہ کر ہی خدمت کرنا ضروری ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاوّل ۱۳۷۵ھ۔ جنوری ۱۹۵۶ء)

پردہ اور پسند کی شادی

سوال:-

اسلامی پردے کی رُو سے جہاں ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں دو ایسے نقصانات بھی ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا بجز اس کے کہ صبر و شکر کر کے بیٹھ جائیں۔

اوّل یہ کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی جس کا ایک خاص ذوق ہے اور جو اپنے دوست منتخب کرنے میں ان سے ایک خاص اخلاق اور ذوق کی توقع رکھتا ہے، فطرتاً اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ شادی کے لیے ساتھی بھی اپنی مرضی سے منتخب کرے۔ لیکن اسلامی پردے کے ہوتے ہوئے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کے لیے اس بات

گنجائش نہیں رہتی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا ساتھی چُنے بلکہ اس کے لیے وہ قطعاً دوسروں یعنی ماں یا خالہ وغیرہ کے دستِ نگر ہوتے ہیں ہماری قوم کی تعلیمی حالت ایسی ہے کہ والدین عموماً ان پڑھ اور اولاد تعلیم یافتہ ہوتی ہے اس لیے والدین سے یہ توقع رکھنا کہ موزوں رشتہ ڈھونڈ لیں گے ایک عبث توقع ہے۔ اس صورت حال سے ایک ایسا شخص جو اپنے مسائل خود حل کرنے اور خود سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک لڑکی جو گھر سے باہر نکلنے کی پابند ہو وہ کیونکر ایسی وسعتِ نظر، فراست اور عقل عام کی مالک ہو سکتی ہے کہ بچوں کی بہترین تربیت کر سکے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح سے بیدار کر دے، اس کو تو دنیا کے معاملات کا صحیح علم ہی نہیں ہو سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی تعلیم بھی حاصل کر لے جتنی ایک بے پردہ لڑکی نے حاصل کی ہوتی ہے تو بھی اس کی ذہنی سطح کم ہو گی کیونکہ اسے اپنے علم کو عمل طور پر پرکھنے کا کوئی موقع ہی حاصل نہیں۔ امید ہے آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے۔

جواب :۔

آپ نے اسلامی پردے کی جن خرابیوں کا ذکر کیا ہے اوّلاً تو وہ ایسی خرابیاں نہیں ہیں کہ اس کی بنا پر آدمی لاینحل مشکلات میں مبتلا ہو جائے اور

ثانیاً حیاتِ دنیوی میں آخر کونسی ایسی چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن کسی چیز کے مفید یا مضر ہونے کا اس کے صرف ایک یا دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر اس میں مصالح کو غلبہ حاصل ہے یا مفاسد کو۔ یہی اصول پردے کے بارے میں اختیار کیا جائے گا۔ اسلامی پردہ آپ کی رائے میں بھی بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ لیکن فقط یہ مشکل کہ اس کی پابندی سے آدمی کو شادی کے لیے اپنی مرضی کے مطابق لڑکی منتخب کرنے کی آزادی نہیں مل سکتی، پردے کی افادیت کو کم یا اس کی پابندی کو ترک کرنے کے لیے وجہِ جواز نہیں بن سکتی۔ بلکہ اگر ہر لڑکے کو لڑکی کے انتخاب اور ہر لڑکی کو لڑکے کے انتخاب کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو اس سے اس قدر تلخ نتائج برآمد ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر خاندانی نظام جو کہ معاشرے کی مضبوطی اور پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور ایک موہومہ مشکل کو حل کرتے کرتے بے شمار حقیقی مشکلات کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا یہ خیال کہ باپردہ لڑکی وسعتِ نظر اور فراست سے بے بہرہ ہوتی ہے درست نہیں ہے۔ اور اگر اسے بالفرض درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں پردے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایک لڑکی باپردہ رہ کر بھی علم و فن میں کمال پیدا کر سکتی ہے اور اس کے مقابلے میں پردے سے باہر ہو کر بھی ایک لڑکی علم و عقل اور فراست و بصیرت سے کوری

رہ سکتی ہے۔ البتہ بے پردہ لڑکی کو یہ فوقیت ضرور ہوگی کہ وہ معلومات کے
لحاظ سے چاہے وسیع النظر نہ ہو لیکن تعلقات کے لحاظ سے ان کی نگاہیں
ضرور پھیل جائیں گی۔ ایسی حالت میں اگر موزوں ترین رفیقِ حیات کی تلاش
میں کامیابی ہو بھی جائے، تب بھی جو نگاہیں وسعت کی عادی ہو چکی ہوں
انہیں سمیٹ کر ایک مرکز تک محدود رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

پسند کی شادی میں رکاوٹیں

جواب:۔

آپ کا جواب ملا۔ مگر مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ آپ نے
اُسے بالکل معمولی مسئلہ قرار دیا۔ کامیاب شادی کی تمنا تو ایک جائز خواہش
ہے اور ایسے حالات پیدا کرنا، جن کی وجہ سے ایک شخص کے لیے
اپنی پسند کی لڑکی چننے کا راستہ بند ہو جائے، میں انسانی مسرت اور شخصیت
کے ارتقاء کے لیے مضر سمجھتا ہوں اور دینِ فطرت کے منافی۔
جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ہمارے مروجہ طریقے کے مطابق عورت
زیادہ سے زیادہ گھر کی منتظم ہوتی ہے اور خاوند کی اور اپنی جنسی تسکین کا
ایک ذریعہ، لیکن دو افراد کے اپنے آپ کو پوری طرح ایک دوسرے
کے حوالے کرنے اور زندگی کے فرائض ایک بار کی بجائے خوشی خوشی
پورا کرنے کے جو امکانات اپنی پسند اور ذوق کی شادی کر لینے میں ہوتے

ہیں وہ اس صورت میں قطعاً ممکن نہیں کہ اپنی پسند اور بصیرت استعمال کیے بغیر کسی دوسرے کے انتخاب پہ شادی کر لی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ایک نوجوان محض جنسی تسکین کا خواہشمند نہیں ہوتا، وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی کے لیے کچھ قربانی کرے، کسی سے محبت کرے، کسی کی خوشی کا خیال رکھے اور کوئی اس کی خوشی پہ خوش ہو۔ اس جذبے کے فطری نکاس کا راستہ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جسے اس نے تعلیم، اطوار، کردار اور دوسری خوبیوں کی بنا پہ اپنی طبیعت کے مطابق حاصل کیا جاتا ہے (حقیقی محبت کسی کی باطنی خوبیوں کے دیکھنے سے ہی پیدا ہوتی ہے نہ کہ شکل دیکھ لینے سے) اور یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ پہلے تو کسی کی شادی کرا دی جائے اور پھر اس سے مطالبہ کیا جائے کہ اب اسے چاہو اور یوں جیسے تم نے اس کو خود پسند کیا ہے۔ اس فطری محبت کا راستہ بند کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ اپنے لیے دوسرے راستے نکال لیتا ہے۔

پردے کی وجہ سے جو حالات پیدا ہیں ان میں حقیقتاً کردار دیکھ کر بر تلاش کرنا ممکن نہیں۔ لڑکے کے باپ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ لڑکی کا پتہ چلا سکے، لڑکی کی والدہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لڑکے کے متعلق براہِ راست کچھ اندازہ لگا سکے۔ کیونکہ پردے کی وجہ سے ان افراد میں بھی تعلق اور آزادانہ گفتگو ناممکن ہے۔ (خود لڑکے اور لڑکی کا ملنا تو ایک طرف رہا) بڑی سے بڑی آزادی جو اسلام نے دی ہے وہ یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کی شکل دیکھ لے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کی شکل چند سیکنڈ دیکھ لینے سے کیا

ہو جاتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے، اب تو تمام علماء نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ موجودہ تمدنی ضروریات پوری کرنے کے لیے علم کا حاصل کرنا عورتوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی کام کر سکتی ہیں۔ یا تو اسلامی احکام کی پابندی کریں یا علم حاصل کریں۔ پردے کی پابند ہوتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ طبقات الارض، آثارِ قدیمہ، انجینیرنگ اور تمام ایسے علوم جن میں سرمایہ اور دور دراز سفر کی ضرورت ہوتی ہے، ان علوم کے لیے خواتین کس طرح کام کر سکتی ہیں جب کہ محرم کے بغیر عورت کا تین دن سے زائد کی مسافت پر نکلنا بھی منع ہے۔ اب کیا ہر جگہ وہ اپنے ساتھ محرم کو لیے لیے پھرے گی؟

یہ علوم تو ایک طرف رہے، میں تو ڈاکٹری اور پردے کو بھی ایک دوسرے کی ضد سمجھتا ہوں۔ اوّل تو ڈاکٹری کی تعلیم ہی جو جسمانیات کی نگاہیں پھیلا دینے والے معلومات سے پُر ہوتی ہے، حیا کے اس احساس کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے جس کی مشرقی عورتوں سے توقع کی جاتی ہے۔ خواہ وہ ڈاکٹری پردے ہی میں سیکھی جائے اور پڑھانے والی تمام خواتین ہی کیوں نہ ہوں۔ دوم ڈاکٹر بننے پر ایک خاتون کو مریضوں کے لواحقین سے روابط کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے غیر مردوں سے بات چیت پر قدغن لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس کے پیش نظر اگر ہم خواتین کو ڈاکٹر بننے سے روک سکتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے گھروں کی مریض خواتین کے ہر مرض کے علاج کے

لیے مرد ڈاکٹروں کی خدمات کی ضرورت پڑے گی اور رائج الوقت نظریہ حیا
کے مطابق یہ تو اس سے بھی زیادہ معیوب سمجھا جائے گا۔

جناب عالی آپ مجھے بتائیں کہ ان معاشرتی اور تمدنی الجھنوں کا اسلامی احکامات
کی پابندی کرتے ہوئے کیا حل ہے ؟

جواب :-

آپ کا دوسرا خط ملا۔ شادی کے معاملے میں آپ نے جو الجھن بیان
کی ہے وہ اپنی جگہ درست ہی سہی، اس کا حل کورٹ شپ کے سوا اور
کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ جس تفصیل کے ساتھ رفیقِ زندگی بنانے سے پہلے لڑکی
اور لڑکے کو ایک دوسرے کے اوصاف، مزاج، عادات، خصائل اور
ذوق و ذہن سے واقف ہونے کی ضرورت آپ محسوس کرتے ہیں، ایسی
تفصیلی واقفیت دو چار ملاقاتوں میں، اور وہ بھی رشتہ داروں کی موجودگی
میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے مہینوں ایک دوسرے کے ساتھ ملنا
تنہائی میں بات چیت کرنا، سیر تفریح، سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ
رہنا اور بے تکلف دوستی کی حد تک تعلقات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ کیا واقعی
آپ یہی چاہتے ہیں کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اس اختلاط
کے مواقع بہم پہنچنے چاہئیں۔ آپ کے خیال میں ان جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے
اندر ان معصوم فلسفیوں کا فی صدی تناسب کیا ہوگا جو بڑی سنجیدگی کے ساتھ صرف
رفیقِ زندگی کی تلاش میں مخلصانہ تحقیقاتی روابط قائم کریں گے اور اس دوران میں شادی
ہونے تک اس طبعی جذب و انجذاب کو قابو میں رکھیں گے جو خصوصیت کے

ساتھ نوجوانی کی حالت میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے اپنے اندر رکھتے ہیں ؟ بحث برائے بحث اگر آپ نہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ شاید دو تین فی صدی سے زیادہ ایسے لوگوں کا اوسط ہماری آبادی میں نکلے گا۔ باقی اس امتحانی دور ہی میں فطرت کے تقاضے پورے کر چکے ہوں گے اور وہ دو تین فیصدی جو اس سے بچ نکلیں گے، وہ بھی اس شبہ سے نہ بچ سکیں گے کہ شاید وہ باہم ملوث ہو چکے ہوں۔

پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لڑکا اور لڑکی جو اس تلاش و حقیقت کے لیے باہم خلا ملا کریں گے وہ لازماً ایک دوسرے کو رفاقت کے لیے منتخب ہی کر لیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ ۲۰ فیصدی دوستیوں کا نتیجہ نکاح کی صورت میں برآمد ہو۔ ۸۰ فیصدی یا کم از کم ۵۰ فیصدی کو دوسرے یا تیسرے تجربے کی ضرورت لاحق ہو گی۔ اس صورت میں ان "تعلقات" کی کیا پوزیشن ہو گی جو دوران تجربہ میں آئندہ نکاح کی امید پہ پیدا ہو گئے رہتے اور ان شبہات کے کیا اثرات ہوں گے جو تعلقات نہ ہونے کے باوجود ان کے متعلق معاشرے میں پیدا ہو جائیں گے؟

پھر آپ یہ بھی مانیں گے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ان مواقع کے دروازے کھولنے کے بعد انتخاب کا میدان لامحالہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ ایک ایک لڑکے کے لیے صرف ایک ہی ایک لڑکی مطمع نظر نہ ہو گی جس پہ وہ اپنی نگاہ انتخاب مرکوز کر کے تحقیق و امتحان کے مراحل طے کرے گا اور علیٰ ہذا القیاس لڑکیوں میں سے بھی ہر ایک کے لیے ایک ہی ایک لڑکا امکانی شوہر کی حیثیت سے زیر امتحان نہ ہو گا۔ بلکہ شادی کی منڈی میں ہر طرف ایک جاذب

نظر مال موجود ہوگا جو امتحانی مراحل سے گزرتے ہوئے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے سامنے بہتر انتخاب کے امکانات پیش کرتا رہے گا۔ اس وجہ سے اس امر کے امکانات روز بروز کم ہوتے جائیں گے کہ ابتداءً جو دو فرد ایک دوسرے سے آزمائشی ملاقاتیں شروع کریں وہ آخر وقت تک اپنی اس آزمائش کو نباہیں اور بالآخر ان کی آزمائش شادی پہ منتج ہو۔

اس کے علاوہ یہ ایک فطری امر ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ جو رومانی طرز کا کورٹ شپ کرتے ہیں ان میں دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے روشن پہلو ہی دکھاتے ہیں۔ مہینوں کی ملاقاتوں اور گہری دوستی کے باوجود ان کے کمزور پہلو ایک دوسرے کے سامنے پوری طرح نہیں آتے۔ اس دوران میں شہوانی خواہش اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے شادی کر لینا چاہتے ہیں، اور اس غرض کے لیے دونوں ایک دوسرے سے ایسے ایسے پیمانِ وفا باندھتے ہیں، اتنی محبت اور گرویدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ شادی کے بعد معاملات کی زندگی میں وہ عاشق و معشوق کے اس پارٹ کو زیادہ دیر تک کسی طرح نہیں نباہ سکتے، یہاں تک کہ جلدی ہی ایک دوسرے سے مایوس ہو کر طلاق کی نوبت آ جاتی ہے۔ کیونکہ دونوں ان توقعات کو پورا نہیں کر سکتے جو عشق و محبت کے دور میں انہوں نے باہم قائم کی تھیں اور دونوں کے سامنے ایک دوسرے کے وہ کمزور پہلو آ جاتے ہیں جو معاملات کی زندگی ہی میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ عشق و محبت کے دور میں کبھی نہیں کھلتے۔

اب آپ ان پہلوؤں پہ بھی غور کر کے دیکھ لیں۔ پھر آپ مسلمانوں کے موجودہ طریقے کی مزعومہ قباحتوں اور اس کورٹ شپ کے طریقے کی قباحتوں کے درمیان موازنہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ آپ کو ان دونوں میں سے کونسی قباحتیں زیادہ قابلِ قبول نظر آتی ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی آپ کورٹ شپ ہی کو زیادہ قابلِ قبول سمجھتے ہیں تو مجھ سے بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خود یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس اسلام کے ساتھ آپ اپنا تعلق رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں جو اس راستے پہ جانے کی اجازت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے۔ یہ کام آپ کو کرنا ہو تو کوئی دوسرا معاشرہ تلاش کریں۔ اسلام سے سرسری واقفیت بھی آپ کو یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اس دین کی حدود میں "کامیاب شادی کا وہ نسخہ استعمال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جسے آپ بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ نے جن مشکلات کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ فطرت نے عورت اور مرد کے دائرہ کار الگ رکھے ہیں۔ اپنے دائرہ کار کے فرائض انجام دینے کے لیے عورت کو جس بہتر سے بہتر تعلیم کی ضرورت ہے وہ اسے ضرور ملنی چاہیے اور اسلامی حدود میں وہ پوری طرح دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے ایسی علمی و ذہنی ترقی بھی ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے جو عورت کو اپنے دائرہ کار کے فرائض انجام دیتے ہوئے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس معاملہ میں کوئی انتظامات نہ کرنا مسلمانوں کی

کوتاہی ہے نہ کہ اسلام کی۔ لیکن وہ تعلیم جو مرد کے دائرہ کار کے لیے عورت کو تیار کرے عورت ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تباہ کن ہے اور اس کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے آپ میری کتاب "پردہ" کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۵۔ عدد ۴۔ جنوری ۱۹۶۱ء)

لفظِ نکاح کا اصل مفہوم

سوال:۔

ترجمان القرآن بابت ماہ مارچ ۱۹۶۲ء میں تفہیم القرآن کے تحت آپ نے جو احکام مستنبط فرمائے ہیں، ان میں سے پہلے ہی مسئلہ میں آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ "قرآن نکاح کا لفظ بول کر صرف عقد مراد لیتا ہے" یا قرآن اسے اصطلاحاً" صرف عقد کے لیے استعمال کرتا ہے"۔ یہ قاعدہ کلیہ نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاں کے غالب فقہی مسلک یعنی حنفیہ کے نزدیک ناقابلِ تسلیم ہے بلکہ جمہور اہلِ تفسیر کی تصریحات کے بھی منافی ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسی بات جس کے حق میں شاید ہی کسی نے رائے دی ہو آپ نے قاعدۂ کلیہ کے طور پہ بیان فرما دی ہے۔

جواب :-

یہ ایک لمبی بحث ہے کہ لغت کے اعتبار سے نکاح کے معنی کیا ہیں علمائے لغت میں اس امر پہ بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عربی زبان میں نکاح کے اصل معنی کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ ان دونوں میں مشترک ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی عقد تزویج کے ہیں اور وطی کے لیے اور عقد کے لیے مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی وطی کے ہیں اور عقد کے لیے مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن راغب اصفہانی نے پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "لفظِ نکاح کے اصل معنی عقد ہی کے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارۃً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے" اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنی جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پہ اسے عقد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔" اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لیے عربی زبان میں یا دنیا کی کسی دوسری زبان میں حقیقۃً وضع کیے گئے ہیں وہ سب فحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں ان کو زبان پہ لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقۃً اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہو اُسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لیے مجاز و استعارہ کے طور پہ استعمال کیے اس معنی کو ادا کرنے کے لیے تو دنیا کی ہر زبان میں مہذّب الفاظ ہی استعمال کئے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

علمائے احناف بالعموم یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لفظ حقیقۃً وطی کے لیے

اور مجازاً عقد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ احناف کی متفق علیہ رائے نہیں ہے۔ بعض مشائخ حنفیہ اس لفظ کو وطی اور عقد کے درمیان مشترک معنوی بھی قرار دیتے ہیں۔ پھر نکاح کی شرعی تعریف تو ان کے ہاں یہی ہے کہ "جو عقد یفید ملک المتعۃ قصداً" یا "عقد وضع لتملیک منافع البضع"۔

میرے نزدیک قرآن و سنت میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد لازماً عقد تزویج ہی ہے اور جب یہ لفظ مطلقاً استعمال ہوگا تو اس سے مراد عقد ہی لیا جائے گا الا یہ کہ کوئی قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ یہاں مراد محض وطی یا عقد مع الوطی ہے۔ رہی وطی بلا عقد تو اس کے لیے لفظ نکاح کے استعمال کا جواز لغت میں تو ہو سکتا ہے لیکن قرآن و سنت میں اس کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں ہے۔ آپ کے علم میں ہو تو پیش فرمائیں۔

(اس کے جواب میں سائل نے فقہ کی بعض کتابوں سے مفصل عبارتیں نقل کر کے بھیجیں۔ اس پر ان کو حسب ذیل جواب دیا گیا۔ م)

افسوس ہے کہ کسی مسئلے پر زیادہ طویل بحث کی فرصت مجھے میسر نہیں، تاہم اجمالاً ایک بار پھر اپنے مدعا کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اطمینان نہ ہو تو مضائقہ نہیں۔ آپ اپنی رائے پر قائم رہ سکتے ہیں اور میں اپنی رائے پر۔

نکاح سے مراد عقد اور وطی بعد عقد لینے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے مراد وطی بغیر عقد بھی لی جا سکتی ہے؟ اس چیز کے ماننے میں مجھے تامل ہے، کیونکہ شرعاً اس کے لیے زنا اور سفاح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اس قبیح فعل پر لفظ نکاح کا اطلاق جائز تسلیم

کرنے کے لیے ان دلائل سے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت ہے جو آپ نے نقل فرمائے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ نکاح کا لفظ اصلاً فعلِ مباشرت کے لیے وضع ہوا تھا اور پھر مجازاً عقد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ فعلِ مباشرت کے لیے دنیا کی جس زبان میں بھی کوئی لفظ وضع ہوا ہے (یعنی جو استعارہ و کنایہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ صراحۃً اسی فعل کے لیے موضوع ہے) وہ قبیح و شنیع ہے اور کسی زبان میں بھی اس کو عقد کے لیے مجازاً استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس فعل کے لیے جو لفظ مستعمل ہے اسے آخر کون شخص بیاہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

خود آپ کے پیش کردہ حوالوں سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ لفظِ نکاح کے اصل معنی ضم کے ہیں۔ اب کیا یہ بات ماننے کے لائق ہے کہ یہ لفظ اصلاً مجرد فعلِ مباشرت کے لیے (بلالحاظ اس کے کہ عقد ہو یا نہ ہو) وضع ہوا تھا؟

بلاشبہ ایسی مثالیں لغت میں ملتی ہیں جن میں یہ لفظ محض مباشرت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس لفظ کا اصل مفہوم مباشرت ہے اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن اور حدیث سے جو مثالیں آپ نے دی ہیں ان پر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کی دوسری تاویل ممکن نہ ہو۔ مثلاً میں زنا سے حرمتِ مصاہرت کا قائل ہوں۔ مگر میرے نزدیک قرآن کی آیت ولا تنکحوا ما نکح اٰباءکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "جن

عورتوں سے تمہارا باپ زنا کر چکا ہو ان سے تم نہ زنا کرو اور نہ عقد۔ بلکہ میں اس کا مطلب یہی لیتا ہوں کہ جن عورتوں سے باپ کا نکاح ہو چکا ہو، ان سے اولاد کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس سے بالتبع یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ باپ سے جس عورت کا بھی شہوانی تعلق کسی طرح ہو گیا ہے وہ بیٹے پر حرام ہے اور بیٹے کا تعلق جس عورت سے ہو گیا ہے وہ باپ پر حرام ہے۔ ناکح الید ملعون میں بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ حضورؐ نے استعارہ کی زبان میں استمنا بالید کرنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو اپنے ہی ہاتھ سے بیاہ کر رہا ہے۔ ایسی ہی تاویل دوسرے نظائر کی بھی کی جا سکتی ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۶ - ستمبر ۱۹۶۲ء)

عورت کی عصمت و عفت کا مستقبل

سوال:-

مارننگ نیوز (کراچی) کا ایک کٹنگ ارسالِ خدمت ہے۔ اس میں انگلستان کی عدالتِ طلاق کے ایک سابق جج سرہربرٹ ولنگٹن نے ایک مکمل بیوی کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اس کٹنگ کا ترجمہ یہ ہے۔

رومن کیتھولک عدالت طلاق کے سابق جج سرہربرٹ ولنگٹن نے اپنے ایک فیصلہ میں ایک مکمل بیوی کی چودہ خصوصیات گنائی ہیں جن

کی تفصیل یہ ہے :
صدری کشش، عقلمندی، محبت، نرم خوئی، شفقت، خوش اطواری، جذبہ تعاون، صبر و تحمل، غور و فکر، بے غرضی، خندہ روئی ایثار، کام کی لگن اور وفاداری۔

سر ہربرٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا ہے کہ یہ تمام خصوصیات ان کی دوسری بیوی میں موجود تھیں جس سے انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد شادی کی تھی۔ سر ہربرٹ جنہوں نے اپنی عدالت میں سینکڑوں ناکام شادیوں کو فسخ کیا ہے ۹۸ برس کی عمر پا کر جنوری ۱۹۶۲ء میں وفات پا گئے ہیں۔

اس کٹنگ سے واضح ہوتا ہے کہ سر ہربرٹ نے عفت یا پاکدامنی جیسی خوبی کو ان چودہ نکاتی فہرست میں برائے نام بھی داخل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ گویا اب پاکدامنی کا شمار عورت کی خوبیوں میں نہیں کیا جاتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک عورت پاکدامنی کے بغیر کس طرح خاوند کی وفادار رہ سکتی ہے ؟

جواب :۔

آپ کا عنایت نامہ ملا جس کے ساتھ آپ نے انگلستان کی ایک عدالتِ طلاق کے جج کی وصیت ارسال کی ہے اور مجھے اس پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب کے ہاں سے یہ تخیل اب قریب ختم ہی ہو چکا ہے کہ پاکدامنی بھی عورت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔

اختلاطِ مردوزن کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ہاں بدکاری بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ معاشرے کو اب اس کے رواجِ عام سے اپنے آپ کو مانوس کرنا پڑا۔ اب وہاں کوئی شخص بھی یہ توقع نہیں رکھتا کہ شادی کے روز اسے بیوی کنواری ملے گی اور شادی کے بعد بھی وہ باعفت اور وفاشعار رہے گی۔ وہاں مرد بالعموم کورٹ شپ کے دوران میں خود اپنی ہونے والی بیوی سے زنا کر چکا ہوتا ہے اور اکثر شادی ہی اس وقت ہوتی ہے جب لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں آخر آپ یہ توقع ہی کیسے کر سکتے ہیں کہ ان کے ہاں اب تک پاکدامنی عورت کی ایک محمود صفت اور بیوی کی ایک لازمی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان کا کیا ذکر ہے۔ ہمارے حکمران طبقوں اور اونچی سوسائٹی کے لوگوں کی بدولت اب جس رفتار سے ہمارے ہاں اختلاطِ مردوزن بڑھ رہا ہے اور خاندان منصوبہ بندی کے نام سے ضبطِ ولادت کے طریقوں کو جس طرح عام کیا جا رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے خود ہمارے ہاں یہی حالات پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو یا تو ہدایت دے یا پھر ہماری قوم کو ان سے نجات دے جو خود بگڑے ہیں اور ساری قوم کو بگاڑ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۶۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

بیوی اور والدین کے حقوق

سوال :-

میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، جن سے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئی ہیں۔ لیکن ایک چیز جو پہلے بھی دل میں کھٹکتی تھی اور اب بھی کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں عورتوں کا درجہ کافی بلند کیا ہے، وہاں بحیثیت بیوی کے بعض امور میں اس کو حقیر بھی کر دیا ہے۔ مثلاً اس پر تین تین سوکنوں کا جلاپا جائز کر دیا ہے، حالاں کہ قدرت نے عورت کی فطرت میں حسد بھی رکھا ہے۔ اسی طرح جہاں بیوی کو شوہر کے قبضہ و اختیار میں رکھا گیا ہے، وہاں شوہر کو اپنے والدین کے قبضہ و اختیار میں کر دیا ہے۔ اسی طرح شوہر والدین کے کہنے پر بیوی کی ایک جائز خواہش کو بھی پامال کر سکتا ہے۔ ان امور میں بظاہر بیوی کی حیثیت چار پیسے کی گڑیا سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ میں ایک عورت ہوں اور قدرتی طور پر عورت کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہوں۔ آپ براہ کرم اس بارے میں میری تشفی فرمائیں۔

جواب :-

آپ نے دو وجوہ کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عورت کی پوزیشن خانگی زندگی میں فروتر رکھی گئی ہے۔ ایک یہ کہ مرد کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے دوسرے یہ کہ شوہر کو والدین کا تابع رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے

بسا اوقات وہ اپنی بیوی کے جذبات اور اس کی خواہشات کو والدین کی رضا پر قربان کر دیتا ہے۔ ان وجوہ میں سے پہلی وجہ پر اگر آپ غور کریں تو یہ بات بہت آسانی کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ عورت کے لیے تین سوکنوں کا برداشت کرنا جتنا تکلیف دہ ہے، اس سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ چیز اس کے لیے یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے شوہر کی کئی کئی محبوبائیں اور داشتائیں ہوں۔ اسلام نے اسی کو روکنے کے لیے مرد کو ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایک مرد ناجائز تعلقات میں جتنا بے باک ہو سکتا ہے، شادیاں رچانے میں اتنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شادی کی صورت میں مرد کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور طرح طرح کی پیچیدگیوں سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ دراصل عورتوں ہی کے فائدے کے لیے ایک روک تھام ہے نہ کہ مردوں کے لیے بے جا رعایت۔ دوسرے طریقے کا تجربہ آجکل مغرب کی سوسائٹی کر رہی ہے وہاں ایک طرف تو جائز سوکنوں کا سدباب کر دیا گیا ہے لیکن دوسری طرف ناجائز سوکنوں سے عورت کو بچانے کا کوئی انتظام اس کے سوا نہیں کیا گیا کہ وہ انہیں برداشت نہ کر سکے تو شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لیے عدالت میں نالش کر دے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس سے عورت کی مصیبت کچھ کم ہو گئی ہے؟ چھڑی چھٹانک عورت تو شاید سوکن سے بچنے کے لیے طلاق کو آسان سمجھ لے مگر کیا بچوں والی عورت کے لیے بھی یہ نسخہ آسان ہے؟

دوسری جس شکایت کا اظہار آپ نے کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ غالباً آپ ابھی تک صاحب اولاد نہیں ہیں، یا اگر ہیں تو آپ کے کسی لڑکے کی

ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ آپ اس خاص معاملے کو ابھی تک صرف بہو کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ جب آپ اپنے گھر میں خود بہو لے آئیں گی اور اس معاملے پر ماں کی حیثیت سے غور کریں گی تو یہ مسئلہ اچھی طرح آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ بیوی کے حقوق کتنے ہونے چاہئیں اور ماں باپ کے کتنے؛ بلکہ اس وقت شاید آپ خود انہی حقوق کی طالب ہوں گی جن پر آج آپ کو اعتراض ہے۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۷۶ھ ۔ نومبر ۱۹۵۶ء)

قرآن میں زنا کی سزا

سوال :۔

آپ نے میرے مضمون "قرآن میں چوری کی سزا" پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس کے لیے شکریہ۔ اب اسی قسم کا ایک اور مضمون "قرآن میں زنا کی سزا" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ میری استدعا ہے کہ آپ اس پر بھی اظہارِ خیال فرمائیں۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو جناب کی دونوں تنقیدوں کو یکجا جواب دوں گا۔

یہاں سرسری طور پر اس قدر گزارش کرنا ضروری ہے کہ آپ نے میری اس تشریح کے بارے میں نکتہ چینی نہیں فرمائی کہ قرآن نے جو سزا بیان کی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے، اور کم سے کم سزا بھی

کی قوتِ تمیزی پر منحصر ہے۔ اور نہ اس بارے میں کچھ فرمایا کہ دنیا میں
کسی جرم کی سزا مجرم کو آخرت کی سزا سے محفوظ رکھتی ہے۔

نوٹ : مستفسر کے محولہ بالا مضمون کے چند ضروری
اقتباسات درجِ ذیل ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں جواب کو
دیکھا جا سکے۔

"ہم اپنے مضمون (قرآن میں چور کی سزا) میں تبلا چکے ہیں کہ سارقہ
سے مراد سرقہ کے تمام مددگار لوگ ہیں، خواہ وہ مؤنث ہوں یا مذکر،
اور خود عورت اگر چور ہے تو وہ لفظِ سارق میں بھی داخل ہے اور
سارقہ بھی ہے۔ یہاں بھی (آیت الزانیۃ والزانی میں) وہی کیفیت
ہے۔ زانیہ میں فعلِ زنا کے تمام مددگار لوگ شامل ہیں، خواہ وہ دلال
ہوں، دلالہ ہوں یا پیغام رساں ہوں، یا زانیوں کے لیے آسانیاں فراہم
کرنے والے، یا زنا کے مفعول ہوں، وغیرہ وغیرہ"______

"چور کی سزا کو بیان کرتے ہوئے "سارقہ" کو سارق کے بعد لایا گیا
تھا، آخر کوئی وجہ ہونی چاہیے کہ یہاں زانیہ کو زانی سے پہلے لایا گیا۔
ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چوری کے جرم میں بڑا مجرم چور ہوتا
ہے اور اس کے مددگار بعد میں۔ مگر زنا کی صورت میں زنا کے مددگار
(یعنی زانیہ) زانی سے مقدم ہیں، کیونکہ ان کی امداد اور رضامندی کے
بغیر فعلِ زنا واقع ہی نہیں ہو سکتا، اس واسطے اسے پہلے لایا گیا۔"
"قرآن نے زنا کی دو سزائیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ زانیوں کو ۱۰۰ کوڑے

مارے جائیں اور دوسری یہ کہ ان کا مقاطعہ (بروئے آیت الزانی لا ینکحہ الا زانیۃ) کر دیا جائے۔ یعنی ان کو مومنین کی جماعت سے علیحدہ کر کے یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ توبہ کیے بغیر مومنین کے اندر نکاح کریں" ـــــ "قرآن میں دیگر احکام کی رُو سے مومن کا مشرکہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں اور یہاں اس کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشرک اور مشرکہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی مشرکہ وہ عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ کسی دوسرے کو حظ اٹھانے میں شریک کرے۔ اور مشرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کو حظ حاصل کرنے میں شریک کرے" ـــــ

"پس زانیہ اور مشرکہ کے معنی میں فرق ہے۔ مشرکہ شوہر دار زانیہ ہے اور زانیہ وہ مرد یا عورت ہے جو فعلِ زنا میں کسی دوسرے کی مدد کرے۔ اپنے آپ کو مفعول بنانے سے یا کسی دوسری طرح۔ اسی طرح زانی اور مشرک میں فرق ہے۔ زانی عام ہے، خواہ اس کی بیوی ہو یا نہ ہو، اور مشرک وہ زانی ہے جس کی بیوی ہو" ـــــ "جو عالم صاحبان ہمارے اس قول کو نہیں مانتے وہ زانی کے لیے صرف ایک ہی سزا تجویز کریں گے، یعنی سَو کوڑے۔ دوسری سزا مقاطعہ ان کے ہاں کوئی سزا نہ ہو گی" ـــــ "ظاہر ہے کہ یہ سَو کوڑے انتہائی سزا ہے۔ ہم نے اپنے مضمون (قرآن میں چور کی سزا) کے اندر لکھا تھا کہ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا انتہائی سزا ہے، کم سے کم سزا جج کی قوتِ تمیزی پر منحصر ہے" ـــــ

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام کی کتاب تعزیرات کی کتاب یعنی قرآن مجید اس قاعدے کے خلاف سب مجرموں کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرے اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے، حالانکہ ہر ایک مجرم کے حالات مختلف ہوتے ہیں جن پر جرم کی شدت اور خفت کا دار و مدار ہوتا ہے" ـــــــ "یہی وجہ ہے کہ خلفائے اربعہ اور خود رسول اکرمؐ نے زنا کی انتہائی حالتوں میں سو کوڑوں کی سزا کو ناکافی خیال کر کے مجرمین کو رجم کی سزا دی، یعنی فتوائے موت صادر کیا تھا ـــــــ ہمارے زمانے میں رجم جائز ہے یا نہ ؟ کم از کم اتنا معلوم تو ہے کہ قرآن میں رجم کا کوئی ذکر نہیں۔ اور جب حالت یہ ہے تو اسے کیوں ایک منسوخ التلاوۃ اور قائم الحکم آیت کی بنا پر زیر بحث لایا جائے تھا ـــــــ زنا کرنے والے کو زندہ رہنے دیا جائے۔ اس لیے اگر بعض مخصوص حالتوں میں زانی کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ مگر وہ صرف فتوائے موت ہو، فتوائے رجم نہ ہو! کیونکہ رجم آج کل کے تمدن کے خلاف ہے اور کوئی انسانی طبیعت رجم کو گوارا نہیں کر سکتی تھی ـــــــ اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ زنا اور چوری کے جرموں کی ایک بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ چور کو توبہ کرنے کا موقع سزا سے قبل دیا گیا ہے اور زانی کو سزا کے بعد دیا۔ (آیت الا الذین تابوا من بعد ذالک ...... الخ)۔ یہاں ذالک کا اشارہ سزا کی طرف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زانی

کسی صورت میں حد سے بری نہیں ہو سکتا مگر چور توبہ کر کے حد سے بری ہو سکتا ہے، بشرطیکہ قاضی قبول کرے۔"

جواب :۔

عنایت نامہ مع مضمون "قرآن میں زنا کی سزا" پہنچا۔ آپ کے پہلے مضمون اور اس دوسرے مضمون کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، (اور میری اس اظہار رائے پر آپ برا نہ مانیں) کہ آپ آیاتِ قرآن کی تاویل و تفسیر اور احکام شرعیہ کی تشریح میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھتے جو ایک خدا ترس آدمی کو ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ اگر آپ میری نصیحت مانیں تو میں دو باتیں بطور اصول کے آپ کو بتا دوں۔ ایک یہ کہ آپ بطور خود اپنے نظریات قائم کر کے قرآن و سنّت سے جو تعلیم ملے اس کے مطابق نظریات قائم کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ قرآن و سنّت سے کسی مسئلے کا استنباط کرتے وقت سلف کے مجتہدین و مفسرین و محدثین کی تشریحات کو سرے سے نظر انداز نہ کر دیا کریں۔ آپ کو اختیار ہے کہ ان میں سے ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے قبول کر لیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کا آپ کے ساتھ رہنا اس سے بہتر ہے کہ آپ کے سب سے الگ مستقل مذہب بنائیں تفرد صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ آپ قرآن و سنّت کے گہرے مطالعہ سے اعلیٰ درجے کی محققانہ بصیرت بہم پہنچا چکے ہوں۔ (جس کی علامات آپ کی تحریروں میں مجھے نظر نہیں آتیں) اور جس مسئلے میں بھی آپ اپنی متفرد رائے ظاہر کریں اس میں آپ کے دلائل نہایت مضبوط ہوں۔ ان دو باتوں کو اگر آپ ملحوظ رکھیں گے تو مجھے امید ہے کہ اس طرح کی غلطیوں سے محفوظ

رہیں گے جو میں نے آپ کے مضامین میں پائی ہیں۔

میرے لیے آپ کے مضامین پر مفصل تنقید کرنا تو مشکل ہے، البتہ جو نمایاں غلطیاں بیک نظر دیکھ سکا ہوں انہیں بیان کیے دیتا ہوں۔

(۱) آپ کا یہ قول ایک حد تک صحیح ہے کہ قرآن میں چوری اور زنا کی جو سزا بیان کی گئی ہے وہ انتہائی سزا ہے، کم سے کم سزا جج کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ لیکن اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ اس بات کی تصریح بھی ضروری ہے کہ جب زنا کے لیے وہ شہادت بہم پہنچ جائے جو شرعاً ضروری ہے، اور جب شرعی قواعد کے مطابق چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر چوری اور زنا کی وہی حد جاری کرنی پڑے گی جو قرآن میں مقرر کر دی گئی ہے۔ اس صورت میں حد سے کم سزا دینے کا جج کو اختیار نہیں۔ البتہ کمتر درجہ کی چوریاں کمتر درجہ کی سزاؤں کے قابل ہوں گی، اور ثبوتِ زنا کے بغیر اگر کمتر درجہ کے فواحش شہادت یا قرائن سے ثابت ہوں گے تو ان پر کمتر درجہ کی سزاؤں کے قابل ہوں گی، اور ثبوت پر کمتر درجہ کی سزائیں دی جا سکیں گی۔

(۲) آپ نے اپنے اس مضمون میں بھی اپنی غلطی کا اعادہ کیا ہے کہ الزانیۃ کے معنی "فعلِ زنا کے مددگار لوگ" بیان کیے ہیں اور اس سے مراد "دلال، دلالہ، پیغام رساں اور زانی وزانیہ کے لیے آسانیاں بہم پہنچانے والے" لیے ہیں۔ قرآن صریح طور پر اس معنی سے ابا کرتا ہے۔ جس آیت میں زانی وزانیہ کی سزا بیان کی گئی ہے اس میں الزانی سے پہلے الزانیۃ کا ذکر ہے اور پھر دونوں کے لیے ایک ہی سزا مقرر کی گئی ہے کہ فاجلدوا کل واحد منھما

مائة جلدة ؕ (دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو)۔ لیکن آپ نے اس پر بھی اپنی رائے کو قرآن کے مطابق بدلنے کے بجائے قرآن کے حکم کو اپنی رائے کے مطابق بدلنے کی کوشش فرمائی۔ یہ بڑی بے جا جسارت ہے جس سے پرہیز واجب تھا۔

(۳) مشرک اور مشرکہ کے جو معنی آپ نے بیان کیے ہیں (یعنی مشرکہ وہ عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ دوسرے کو حظ اٹھانے میں شریک کرے اور مشرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کو حظ حاصل کرنے میں شریک کرے) یہ بالکل ہی ایک آزادانہ معنی آفرینی ہے جس کے لیے نہ لغت میں کوئی بنیاد پائی جاتی ہے، نہ اصطلاح میں، اور نہ کوئی قرینہ ہی ایسا موجود ہے جس کی بنا پر ایسے دور از قیاس و گمان معنی لیے جاسکیں۔ آیت اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ...... الخ میں لا ینکح سے مراد لا یلیق بہ ان ینکح ہے۔ یعنی زانی ایک ایسا بدکار ہے کہ وہ کسی عفیفہ مومنہ سے نکاح کرنے کے لائق نہیں ہے، اس کے لیے اگر موزوں ہو سکتی ہے تو ایک بدکار یا مشرکہ عورت ہی ہو سکتی ہے، اور زانیہ ایک ایسی فاسقہ و فاجرہ ہے کہ وہ کسی باعصمت مومن کے لیے موزوں نہیں ہے، وہ اگر نکاح کے لائق ہے تو ایک بدکار یا مشرک مرد کے لیے ہو سکتی ہے۔

اس سے مقصود فعلِ زنا کی قباحت و شناعت واضح کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ صالح اہلِ ایمان کو معروف بالزنا مردوں اور عورتوں سے مناکحت کے تعلقات نہ قائم کرنے چاہئیں۔

(۴) یہ ایک عجیب بات میں نے دیکھی کہ آپ خود تسلیم فرما رہے ہیں کہ خلفائے اربعہ اور رسول اللہ صلعم نے زنا کی انتہائی حالتوں میں (زانی محصن کی آپ تصریح نہیں کرتے) مجرمین کو رجم کی سزا دی ہے، مگر پھر بھی آپ یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ "رجم آج کل کے تمدن کے خلاف ہے اور کوئی انسانی طبیعت رجم کو گوارا نہیں کر سکتی"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ان الفاظ پر آپ خود اگر کبھی غور کریں گے تو آپ کو ندامت محسوس ہوگی۔ کیا کوئی انسانی طبیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ پاکیزہ اور رحیم و شفیق ہو سکتی ہے؟ اور کیا ہم مسلمانوں کے لیے آج کل کا تمدن (اثم بم والا تمدن!) کوئی معیارِ حق ہے؟

یہ چند معروضات میں صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ آپ نے خود مجھ کو اپنے مضامین پر تنقید کی دعوت دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جب اتنا بڑا دل رکھتے ہیں کہ تنقید کی خود دعوت دیتے ہیں تو آپ ضرور میری ان باتوں کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں گے اور اگر حق معلوم ہوں گی تو قبول کریں گے۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاول، ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ۔ جنوری، فروری ۱۹۵۱ء)

دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت و مناکحت کے تعلقات

سوال :-

الجہاد فی الاسلام کے دوران مطالعہ میں ایک آیت وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَالَکُمْ مِنْ وَّلَایَتِھِمْ مِنْ شَیْءٍ ...... الخ نظر سے گزری۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس آیت میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے پہلے مالکم من ولایتھم من شیء سے یہ بتایا گیا ہے کہ "جو مسلمان دارالکفر میں رہنا قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں ان سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی تعلقات نہیں رہ سکتے، نہ وہ باہم رشتہ قائم کر سکتے ہیں اور نہ انہیں ایک دوسرے کا ورثہ و ترکہ مل سکتا ہے" اب عرض یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان "دارالکفر" اور "دارالاسلام" کی صورت میں دو ملک وجود میں آگئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت بھی اظہر من الشمس ہے۔ ان کی ذہنیتیں بھی بڑی حد تک بدل چکی ہیں۔ بالغرض یہ ان سب لوازمات سے لیس ہو چکے ہیں جو ایک غلام قوم کے لیے اَز بس ضروری ہیں۔ بہتیرے رہنے پر مجبور ہیں اور بہت سے وہاں کی رہائش عمداً قبول کیے ہوئے ہیں۔ بعض ہجرت کر کے اپنے دین و ناموس کی حفاظت کی خاطر پاکستان چلے آئے ہیں۔ ان میں

اکثر ایسے بھی ہیں جن کے والدین ہندوستان ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں اور مرتے دم تک اس کو چھوڑنے پر تیار نہیں مگر اولاد پاکستان چلی آئی ہے اور اب ہندوستان کی سکونت اختیار کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں۔ اندریں حالات حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں :

(۱) ایسی حالت میں اولاد، والدین یا کسی اور رشتہ دار کے ورثہ وترکہ سے محروم رہے گی؟ اگر وہ ان کے انتقال پر اپنے حق وراثت کا دعویٰ کریں تو کس حد تک یہ دعویٰ جائز یا ناجائز ہوگا؟

(۲) موجودہ حالات کے پیش نظر کوئی پاکستانی (مہاجر یا اصلی باشندہ) ہندوستانی مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟ کرنے کی صورت میں تعلقات جائز سمجھے جائیں گے یا ناجائز؟

جواب :۔

جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں۔ رہا ان مہاجرین کا معاملہ جن کے ایسے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہیں جن کے وہ وارث ہو سکتے ہیں تو ان کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ نہ وہ ہندوستان میں اپنی میراث پا سکتے ہیں اور نہ ان کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان میں ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں۔ نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو نہیں ٹوٹ سکتا لیکن اگر زوجین میں سے ایک دارالاسلام

میں ہجرت کر آیا ہے اور دوسرا ہجرت پہ تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پہ درخواست دی جاسکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ آئندہ شادی بیاہ کا علق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن۔ شعبان ۱۳۷۰ھ۔ جون ۱۹۵۱ء)

کیا بالغ عورت خود اپنا نکاح کر لینے کی مجاز ہے ؟

سوال :۔

علمائے احناف اور علمائے اہلِ حدیث کے درمیان نکاح بالغہ بلا ولی کے مسئلہ میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ احناف اس کے قائل ہیں کہ بالغہ عورت اپنا نکاح اولیاء کے اذن کے بغیر یا ان کے خواہش کے علیٰ الرغم جہاں چاہے کرسکتی ہے اور اس نکاح پہ اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اہل حدیث حضرات ایسے نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نکاح بلا ولی کی صورت میں بلا تامل دوسرا نکاح کیا جاسکتا ہے۔ فریقین کے دلائل، جہاں تک میرے سامنے ہیں، مختصراً پیش کرتا ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ اس بارے میں اپنی تحقیق واضح فرمائیں :۔

جواب :۔

اس سوال کے ساتھ سائل نے پوری تفصیل کے ساتھ فریقین کے دلائل جمع

کر دیئے ہیں، لہذا پہلے ہم ان دلائل کو یہاں نقل کرتے ہیں :

(۱) حنفیہ کا استدلال حسب ذیل آیات اور احادیث سے ہے

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ج فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط (البقرہ - ۲۹)

تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس روز روکے رکھیں پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو جو کچھ وہ اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے کریں، اس کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ....

(البقرہ ۲۹)

پھر اگر (تیسری بار شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی، تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہ ہوگی الا یہ کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

.... فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ط

(البقرہ ۳۰)

.... پھر تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ وہ بھلے طریقے سے باہم رضامند ہو جائیں۔

عن نافع ابن جبیر عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الایم احق بنفسھا من ولیھا والبکر تستامر واذنھا سکوتھا

وفی روایة الثیب احق بنفسہا من ولیہا۔ (نصب الرایة ج ۳ ص ۱۸۲)

نافع ابن جبیر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ عورت اپنے ولی سے زیادہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی حقدار ہے، اور کنواری کا مشورہ لیا جانا چاہیئے۔ اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنے نکاح کے معاملے میں حقدار ہے۔

عن ابی سلمة ابن عبدالرحمٰن قال جاءت امرأة الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ان ابی انکحنی رجلا وانا کارھة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لابیھا لا نکاح لک، اذھبی فانکحی من شئت۔

(ایضاً)

ابی سلمہ ابن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا میرے باپ نے میرا نکاح ایک مرد سے کر دیا ہے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں۔ آپ نے باپ سے فرمایا کہ نکاح کا اختیار تمہیں نہیں ہے اور لڑکی سے فرمایا جاؤ جس سے تمہارا جی چاہے نکاح کر لو۔

عن عبدالرحمٰن بن القاسم روی من طریق مالک عن ابیہ عن عائشة انہا زوجت حفصة بنت عبدالرحمٰن من المنذر ابن زبیر وعبدالرحمٰن غائب بالشام۔ فلما قدم عبدالرحمٰن قال و مثلی یفتات علیہ؟ فکلمت عائشة المنذر ابن زبیر فقال ان ذلک بید عبدالرحمٰن۔ فقال عبدالرحمٰن ماکنت لارد امرًا

نضیلتہ فاستقرت حفصۃ عند المنذر ولم یکن ذالک طلاق۔

(ایضاً)

مالک نے عبدالرحمٰن سے، انہوں نے اپنے باپ سے، اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے حفصہ بنت عبدالرحمٰن کا منذر ابن زبیر سے نکاح کر دیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن شام میں تھے۔ جب وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ کیا میری رائے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ تب حضرت عائشہ نے منذر ابن زبیر سے بات کی۔ انہوں نے کہا کہ فیصلہ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ سے کہا کہ جس معاملے کو آپ نے طے کر دیا ہے، میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا چنانچہ حفصہ منذر کے پاس ہی رہیں اور یہ طلاق نہ تھی۔

اخرجہ ابوداؤد والنسائی ...... عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس للولی مع الثیب امرٌ۔ (ایضاً)

ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شوہر دیدہ عورت پہ ولی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے

اخرجہ النسائی واحمد ...... عن عائشۃ قالت جاءت فتاۃ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللہ ان ابی زوجنی ابن اخیہ لیرفع بی من خسیستہ قال فجعل الامر الیھا فقالت انی قد اجزت ما صنع ابی، ولکن اردت ان تعلم النساء ان لیس الی الآباء من الامر شیئ۔

نسائی اور احمد نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ ایک لڑکی نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! میرے باپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ میرا بیاہ صرف اس لیے کر دیا ہے کہ میرے ذریعے اُسے ذلت سے نکالے۔ آپؐ نے نکاح (کی تنسیخ و استقرار) کا حق لڑکی کو دے دیا۔ لڑکی نے کہا، میرے والد نے جو کچھ کیا ہے میں اُسے جائز قرار دیتی ہوں، میری خواہش صرف یہ تھی کہ عورتیں جان لیں کہ باپوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

(۲) اہل حدیث حضرات اپنی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث پیش کرتے ہیں:

عن عائشۃ رضی اللہ تعالی عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن ولیہا فنکاحہا باطل۔۔۔۔ فان اشتجروا فالسلطان ولی من لا ولی لہا۔ (بلوغ المرام)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اُس کا نکاح باطل ہے۔۔۔۔ پس اگر جھگڑا ہو تو جس عورت کا ولی نہ ہو تو سلطان اس کا ولی ہے۔

عن ابی موسی عن ابیہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نکاح الا بولی۔ (ایضاً)

ابو موسیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ولی کے بغیر نکاح نہیں جائز نہیں ہے۔"

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تزوج المرأۃ ولا تزوج المرأۃ نفسہا۔ (سنن کبریٰ للبیہقی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دوسری عورت کی ولی بن کر نکاح نہ کرے، اور نہ کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔

قال عمر ابن الخطاب ایما امرأة لم ینکحها الولی او الولاة فنکاحها باطل۔ (ایضاً)

حضرت عمرؓ نے فرمایا جس عورت کا نکاح ولی یا حکام نہ کریں اس کا نکاح باطل ہے۔

عن عکرمة ابن خالد قال جعلت امرأة ثیب امرها بید رجل غیر ولی فانکحها فبلغ ذالک عمر فجلد الناکح والمنکح ورد نکاحها۔

(ایضاً)

عکرمہ ابن خالد سے روایت ہے کہ ایک شوہر دیدہ عورت نے اپنا معاملہ ایک ایسے شخص کے سپرد کردیا جو اس کا ولی نہ تھا اور اس شخص نے عورت کا نکاح کردیا۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے نکاح کرنے اور کرانے والوں کو سزا دی اور نکاح فسوخ کردیا۔

عن علی قال ایما امرأة نکحت بغیر اذن ولیها فنکاحها باطل لا نکاح الا باذن ولی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا جس عورت نے بھی اپنے ولی کے اذن کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے۔ بلا اجازتِ ولی کوئی نکاح نہیں۔

عن الشعبی ان عمر وعلیاً رضی اللہ عنہما وشریحاً ومسروقاً

رحمهما اللہ قالوا لانکاح الا بولی (ایضاً)

امام شعبی سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ، شریحؒ اور مسروقؒ نے فرمایا کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہے۔

ان دلائل پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دونوں طرف کافی وزن ہے اور یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ فریقین میں سے کسی کا مسلک بالکل غلط ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شارع نے فی الواقع دو متضاد حکم دیئے ہیں؟ یا ایک حکم کو دوسرا حکم منسوخ کرتا ہے؟ یا دونوں حکموں کو ملا کر شارع کا منشا ٹھیک طور پر متحقق ہو سکتا ہے؟ پہلی شق تو صریحاً باطل ہے۔ کیونکہ شریعت کا پورا نظام شارع کی حکمتِ کاملہ پر دلالت کر رہا ہے اور حکیم سے متضاد احکام کا صدور ممکن نہیں ہے۔ دوسری شق بھی باطل ہے کیونکہ نسخ کا کوئی ثبوت یا قرینہ موجود نہیں ہے۔ اب صرف تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور ہمیں اسی کی تحقیق کرنی چاہیئے۔ میں دونوں طرف کے دلائل کو جمع کر کے شارع کا جو منشا سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے:

۱۔ نکاح کے معاملے میں اصل فریقین مرد اور عورت ہیں نہ کہ مرد اور اولیائے عورت۔ اسی بنا پر ایجاب و قبول ناکح اور منکوحہ کے درمیان ہوتا ہے۔

۲۔ بالغہ عورت (باکرہ ہو یا ثیبہ) کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر یا اس کی مرضی کے خلاف منعقد نہیں ہو سکتا، خواہ وہ نکاح کرنے والا باپ ہی کیوں نہ ہو۔

جس نکاح میں عورت کی طرف سے رضا نہ ہو، اس میں سرے سے ایجاب ہی موجود نہیں ہوتا کہ ایسا نکاح منعقد ہو سکے۔

۳۔ مگر شارع اس کو بھی جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنے نکاح کے معاملے میں بالکل ہی خود مختار ہو جائیں، اور جس قسم کے مرد کو چاہیں اپنے اولیاء کی مرضی کے خلاف اپنے خاندان میں داماد کی حیثیت سے گھسا لائیں۔ اس لیے جہاں تک عورت کا تعلق ہے شارع نے اُس کے نکاح کے لیے اس کی اپنی مرضی کے ساتھ اس کے ولی کی مرضی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ نہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جہاں چاہے اپنا نکاح کر لے، اور نہ ولی کے لیے جائز ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح جہاں چاہے کر دے۔

۴۔ اگر کوئی ولی کسی عورت کا نکاح بطور خود کر دے تو وہ عورت کی مرضی پر معلّق ہوگا، وہ منظور کرے تو نکاح قائم رہے گا، نامنظور کرے تو معاملہ عدالت میں جانا چاہیئے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ یہ نکاح عورت کو منظور ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عورت کو نکاح نامنظور ہے تو عدالت اسے باطل قرار دے گی۔

۵۔ اگر کوئی عورت اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کر لے تو اس کا نکاح ولی کی اجازت پر معلق ہوگا۔ ولی منظور کرے تو نکاح برقرار رہے گا، نامنظور کرے تو یہ معاملہ بھی عدالت میں جانا چاہیئے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ ولی کے اعتراض و انکار کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ فی الواقع معقول وجوہ کی بنا پر اس مرد کے ساتھ اپنے گھر کی لڑکی کا جوڑ پسند نہیں کرتا تو یہ نکاح فسخ کیا جائے گا اور اگر یہ ثابت

ہو جائے کہ اس عورت کا نکاح کرنے میں اس کا ولی دانستہ تساہل کرتا رہا، یا کسی ناجائز غرض سے اس کو ٹالتا رہا اور عورت نے تنگ آکر اپنا نکاح خود کر لیا تو پھر ایسے ولی کو سیئی الاختیار ٹھیرا دیا جائے گا اور نکاح کو عدالت کی سندِ جواز دے دی جائے گی۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

شادی بیاہ میں کفاءت کا لحاظ

سوال:-

ترجمان القرآن بابت ذی القعدہ و ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۰ھ میں آپ نے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے جواب میں ایک جگہ ایسے تسامح سے کام لیا ہے جو ناقابلِ برداشت ہے۔ مولانا موصوف نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ "کیا ایک سید ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے سید نہ رہے گا بلکہ جلاہا بن جائے گا؟" میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آپ نے بھی جواب میں دبی زبان سے اس غیر اسلامی امتیاز کو یہ کہہ کر تسلیم کر لیا کہ "دارالکفر کے ایک سید صاحب، دارالاسلام کی ایک سیدانی کے باعتبار نسب کفو ہی سہی"۔ آپ کے الفاظ مبہم ہیں۔ کیا آپ بھی مسئلہ کفو کو اسلام میں جائز سمجھتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ قرآن و حدیث سے استشہاد پیش فرما کر میرا اطمینان فرمائیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ دنیا کے کام کاج اور پیشوں کو انسانیت کی اونچ نیچ میں کیوں دخل ہو؟

بنی نوعِ انسان سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے اگر لوہے کا کام کیا ہے تو وہ لوہار ٹھہریں گے؟

جواب:۔

آپ نے کفارت کے مسئلے پر جو اعتراض کیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ طرزِ تعبیر میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن نفسِ مسئلہ کفارت تو عقل اور نقل دونوں سے ثابت ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر، بجائے خود نکاح میں اس کے معتبر ہونے پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

اس مسئلے کا مأخذ متعدد احادیث ہیں۔ مثلاً:

لا تنکحوا النساء الا الاکفاء	عورتوں کی شادیاں نہ کرو مگر
(دارقطنی، بیہقی)	اُن لوگوں کے ساتھ جو کفو ہوں۔
یا علی ثلٰث لا تؤخرھا	اے علیؓ! تین کام ہیں جن کو
الصلوٰۃ اذا اتت، والجنازۃ	ٹالنا نہ چاہیے، ایک نماز، جبکہ
اذا حضرت والایم اذا	اس کا وقت آجائے۔ دوسرے
وجدت کفاءً۔	جنازہ جبکہ تیار ہو جائے۔ تیسرے
(ترمذی، حاکم)	بن بیاہی عورت کا نکاح جبکہ
٭ ٭	اس کے لیے کفو مل جائے۔
تخیروا لنطفکم وانکحوا	اپنی نسل پیدا کرنے کے لیے
الاکفاء	اچھی عورتیں تلاش کرو، اور
٭ ٭	اپنی عورتوں کے نکاح ایسے

لوگ ، سے کر د جوان کے کفو

ہوں ۔

(یہ حدیث حضرت عائشہ ، انس ، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم سے متعدد طریقوں سے مروی ہے)

لا منعن فروج ذوات الاحساب الا من الاکفار ۔ میں شریف گھرانوں کی عورتوں کے نکاح کفو کے سوا کہیں اور نہ کرنے دوں گا ۔

یہ تو ہے اس مسئلے کی نقلی دلیل ۔ رہی عقلی دلیل ، تو عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ کسی لڑکی کو کسی شخص کے نکاح میں دیتے وقت یہ دیکھا جائے کہ وہ شخص اس کے جوڑ کا ہے یا نہیں ۔ اگر جوڑ کا نہ ہو تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ان دونوں کا نباہ ہو سکے گا ۔ نکاح سے مقصود تو عقلاً بھی اور نقلاً بھی یہی ہے کہ زوجین کے درمیان مودّت و رحمت ہو اور وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کر سکیں ۔ آپ خود سوچ لیں کہ بے جوڑ نکاحوں سے اس مقصود کے حاصل ہونے کی کہاں تک توقع کی جا سکتی ہے ؟ اور کونسا معقول انسان ایسا ہے جو اپنے لڑکے یا لڑکی کا بیاہ کرنے میں جوڑ کا لحاظ نہ کرتا ہو ؟

کیا آپ اسلامی مساوات کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مرد کا ہر عورت سے اور ہر عورت کا ہر مرد سے صرف اس بنا پہ نکاح کر دیا جائے کہ دونوں مسلمان ہیں ، بلا اس لحاظ کے کہ ان میں کوئی مناسبت پائی جاتی ہے یا نہیں ؟ فقہاء نے اس جوڑ کا مفہوم مشخص کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک

نے اپنے اپنے طریقے پر یہ بتایا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے درمیان کن کن امور میں مماثلت ہونی چاہیئے۔ ہم ان تفصیلات میں بعض فقہاء سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کر سکتے ہیں۔ مگر فی الجملہ عقل عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ زندگی بھر کی شرکت و رفاقت کے لیے جن دو ہستیوں کا ایک دوسرے سے جوڑ ملایا جائے ان کے درمیان اخلاق، دین، خاندان، معاشرتی طور طریق، معاشرتی عزت و حیثیت، مالی حالات، ساری ہی چیزوں کی مماثلت دیکھی جانی چاہیئے۔ ان امور میں اگر پوری یکسانی نہ ہو تو کم از کم اتنا تفاوت بھی نہ ہو کہ زوجین اُس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور رفاقت نہ کر سکیں۔ یہ انسانی معاشرت کا ایک عملی مسئلہ ہے جس میں حکمت عملی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آدم کی ساری اولاد کے یکساں ہونے کا نظریہ آپ یہاں چلانا چاہیں گے تو لاکھوں گھر برباد کر دیں گے۔ ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ محض نسل و نسب کی بنا پر ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور ایک جاہلی تصور ہے، تو اس بات میں یقیناً میں آپ سے اتفاق کروں گا۔ جن لوگوں نے کفارت کے فقہی مسئلے کو مسخ کر کے ہندوؤں کی طرح کچھ اونچی اور کچھ نیچی ذاتیں قرار دے رکھی ہیں ان پر مجھے بھی ویسا ہی اعتراض ہے جیسا آپ کو ہے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ۔ ستمبر ۱۹۵۲ء)

نکاحِ شغار

سوال :-

مسلمانوں میں عموماً رواج ہو گیا ہے کہ دو شخص باہم لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی اَدل بدل کے اصول پر کرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی اشخاص مل کر اس طرح کا اَدل بدل کرتے ہیں۔ مثلاً زید بکر کے لڑکے کے ساتھ، بکر عمر کے لڑکے کے ساتھ اور عمر زید کے لڑکے کے ساتھ اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں عموماً مہر کی ایک ہی مقدار ہوتی ہے۔ بعض علمائے دین اس طریقہ کو شغار کہتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شغار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

بحالاتِ موجودہ ایک غریب آدمی یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے، کیونکہ جس آسانی سے دوسرے لوگ اس کی لڑکی کو قبول کرنے پر تیار ہوتے ہیں اس آسانی سے اس کے لڑکے کو رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔

براہِ کرم اس مسئلہ کی حقیقت واضح فرمائیں۔

جواب :-

عام طور پر اَدلے بدلے کے نکاح کا جو طریقہ ہمارے ملک میں رائج ہے وہ دراصل اُسی شغار کی تعریف میں آتا ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

منع فرمایا ہے۔ شغار کی تین صورتیں ہیں اور وہ سب ناجائز ہیں۔

ایک یہ کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس شرط پہ اپنی لڑکی دے کہ وہ اس کو بدلے میں اپنی لڑکی دے گا اور ان میں سے ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پائے۔

دوسرے یہ کہ شرط تو وہی آدلے بدلے کی ہو مگر دونوں کے برابر برابر مہر (مثلاً ۵۰،۵۰ ہزار روپیہ) مقرر کیے جائیں اور محض فرضی طور پہ فریقین میں ان مساوی رقموں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ دونوں لڑکیوں کو عملاً ایک پیسہ بھی نہ ملے۔

تیسرے یہ کہ آدلے بدلے کا معاملہ فریقین میں صرف زبانی طور پہ ہی طے نہ ہو بلکہ ایک لڑکی کے نکاح میں دوسری لڑکی کا نکاح شرط کے طور پہ شامل ہو۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو بھی صورت اختیار کی جائے گی، شریعت کے خلاف ہوگی۔ پہلی صورت کے ناجائز ہونے پر تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ البتہ باقی دو صورتوں کے معاملہ میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ لیکن مجھے دلائلِ شرعیہ کی بنا پہ یہ اطمینان حاصل ہے کہ یہ تینوں صورتیں شغارِ ممنوع کی تعریف میں آتی ہیں اور تینوں صورتوں میں اُس معاشرتی فساد کے اسباب یکساں طور پہ موجود ہیں جن کی وجہ سے شغار کو منع کیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن رجب، شعبان ۱۳۷۱ھ۔ اپریل، مئی ۱۹۵۲ء)

منگنی کا شرعی حکم

سوال :-

کیا شرعی لحاظ سے خطبہ نکاح کا حکم رکھتا ہے ؟ عوام اس کو ایجاب و قبول کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر لڑکی کے والدین ٹھیری ہوئی بات کو رد کر دیں تو برادری میں ان کا مقاطعہ تک ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر والدین اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کر دیں تو کیا یہ فعل درست ہو گا ؟

جواب :-

منگنی محض ایک قول و قرار ہے اس بات کا کہ آئندہ اس لڑکی کا نکاح فلاں شخص سے کیا جائے گا۔ یہ بجائے خود نکاح نہیں ہے۔ البتہ فریقین کے درمیان ایک طرح کا عہد و پیمان ضرور ہے جس سے پھر جانا درست نہیں، اِلّا یہ کہ اس کے لیے کوئی معقول وجہ موجود ہو۔ اگر منگنی کے بعد فریقین میں سے کسی ایک پر دوسرے کا کوئی ایسا عیب ظاہر ہو جو پہلے معلوم یا چھپایا گیا تھا، تو بلاشبہ اس قول و اقرار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کی کسی معقول وجہ کے بغیر یونہی اسے ختم کر دینا، یا کسی غیر معقول وجہ کی بنا پر اس سے پھر جانا ہرگز جائز نہیں۔ دوسری بدعہدیوں کی طرح یہ بھی ایک بدعہدی ہے جس پر انسان خدا کے ہاں جواب دِہ ہو گا۔

(ترجمان القرآن محرم، صفر ۱۳۷۲ھ۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

کیا برقع پردے کا مقصد پورا کرتا ہے؟

سوال :-

احقر ایک مدت سے ذہنی اور قلبی طور پر آپ کی تحریک اقامت دین سے وابستہ ہے۔ پردہ کے مسئلہ پر آپ کے افکارِ عالیہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن آخر میں آپ نے مروجہ برقع کو بھی (Defend) کیا ہے۔ اس کے متعلق دو ایک باتیں دل میں کھٹکتی ہیں۔ براہِ مہربانی ان پر روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں۔

پردے کی غایت صنفی میلان کی انتشار پسندی کو روکنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میلان ہر دو اصناف میں پایا جاتا ہے (گو دونوں میں فرق کی نوعیت سے انکار نہیں)۔ اسی وجہ سے پردے کی اصل روح —— غضِ بصر کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ برقع کی "دیوار" کے پیچھے عورتوں کی بہت بڑی اکثریت "نگاہ کے زنا" کی مرتکب ہوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ ان کا یہ اطمینان (Satisfaction) ہوتا ہے کہ ہم تو مردوں کو دیکھ رہی ہیں لیکن مرد ہمیں نہیں دیکھ رہے، اور نہ ہماری اس "نظارہ بازی" کا علم ہی کسی کو ہے۔ سو اس طرح کی خواتین میں جوہرِ حیا —— صنفِ نازک کا اصل جوہر —— بہت کم پایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں برقع اوڑھ کر ایک اوسط معاشی وسائل کے کنبہ کی

عورتیں اپنے کام کاج بھی کما حقہ' انجام نہیں دے سکتیں۔ سفر ہی کو لیجیے' گاڑیوں اور بسوں وغیرہ میں چڑھنا اترنا برقع پوش عورت کے لیے خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔

پردہ ــــ "مکمل پردہ" ــــ کی اہمیت و معقولیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا' لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مروجہ برقع کے بجائے اور کوئی موزوں تر طریقہ استعمال ہو۔ مثال کے طور پر آج سے چند سال پیشتر تک دیہات کی شریف عورتیں خود کو ایک چادر میں مستور کرتی تھیں۔ چادر میں وہ یہ جرأت نہ کرسکتی تھیں کہ کسی مرد کو مسلسل دیکھیں اور ان کی آنکھوں میں شرم و حیا کا بہت اعلیٰ مظاہرہ ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ برقع کی نسبت اس چادر میں بہت اچھی طرح "پردہ" ہوتا تھا۔

آپ کی مصروفیات کے علم کے باوجود آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

جواب:۔

آپ نے اپنے سوال میں کئی چیزوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ بہتر ہو کہ ایک ایک چیز کو آپ الگ الگ لیں اور پھر اس پر غور کر کے رائے قائم کریں۔

پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ کیا غضِ بصر کی تلقین اور اخلاقی تربیت کے بغیر یہ ممکن ہے کہ کوئی عورت کسی غیر مرد کو گھورنے سے روکی جاسکے؟ آپ برقع کی نقاب پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ صرف مرد کو عورت پر نگاہ ڈالنے سے روکتی ہے' عورت کو اس ناجائز نظر بازی سے نہیں روکتی۔ مگر یہ عیب تو صرف نقاب میں نہیں ہے' چادر میں بھی ہے۔ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ

عورت چادر سے منہ ڈھانک کر جب باہر نکلے تو آگے سے راستہ دیکھنے کے لیے کم از کم اتنی جگہ کھلی رکھنی چاہیئے کہ اس کی آنکھ سامنے دیکھ سکے۔ پھر یہ عیب چلمن میں بھی ہے جو آپ دروازوں اور کھڑکیوں پر ڈالتے ہیں۔ بلکہ یہ عیب ہر اس چیز میں ہے جس سے کوئی عورت باہر جھانک سکتی ہو۔ آپ خود بتائیں کہ ان منافذ کو آپ کیسے روک سکتے ہیں؟ اور کیا فی الواقع شریعت کا بھی یہ مطالبہ ہے کہ ان سب منافذ کو روکا جائے؟ علاوہ بریں اسی کتاب پردہ میں میں نے وہ روایت نقل کی ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرتِ عائشہؓ کو حبشیوں کے کھیل کود کا تماشہ دکھایا تھا۔ وہاں میں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مردوں کا عورتوں کو دیکھنا اور عورتوں کا مردوں کو دیکھنا نہ شرعًا بالکل یکساں ہے اور نہ نفسیات کے اعتبار سے ان کی حیثیت برابر ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر برقع بجائے خود بھڑکیلا اور جاذبِ نظر نہ ہو، سادہ اور بے زینت ہو تو شرعًا اس پر کس اعتراض کی گنجائش ہے؟ کیا وہ شریعت کے کسی مطالبہ کو پورا نہیں کرتا؟ اگر کرتا ہے تو ہمارے پاس اس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے نزدیک کوئی دوسری چیز اس سے بہتر طریقہ پر شریعت کے منشا کو پورا کرتی ہو۔ ایسی کوئی چیز آپ کی نگاہ میں ہے تو آپ اسے تجویز کر سکتے ہیں مگر برقع کو ناجائز کہنا کسی طرح درست نہیں۔

برقع اوڑھ کر چلنے پھرنے اور بسوں وغیرہ پر چڑھنے کے سلسلے میں

آپ جو مشکلات بیان کرتے ہیں وہ جواز و عدمِ جواز کی بحث سے غیر متعلق ہیں۔ آپ کے نزدیک چادر میں اس سے کم مشکلات ہیں یا کسی قسم کی مشکلات نہیں ہیں تو خواتین کو اس کی طرف توجہ دلائیں۔ وہ تجربہ سے اسے مناسب پائیں گی تو کیوں نہ اختیار کریں گی۔

(ترجمان القرآن شعبان ۱۳۷۰ھ ۔ مطابق جون ۱۹۵۱ء)

عورت اور سفرِ حج

سوال :-

عورت کے محرم کے بغیر حج پر جانے کے بارے میں علمائے کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ براہِ کرم مختلف مذاہب کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کے نزدیک قابلِ ترجیح مسلک کون سا ہے ؟

جواب :-

عورت کے بلا محرم حج کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس معاملہ میں چار مسلک پائے جاتے ہیں جنہیں مختصراً یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔

(۱) عورت کو کسی حال میں شوہر یا محرم کے بغیر حج نہ کرنا چاہیئے۔ یہ مسلک ابراہیم نخعی، شعبی اور حسن بصری رحمہم اللہ سے منقول ہے اور حنبلی مذہب کا یہی فتویٰ ہے۔

(۲) اگر حج کا سفر تین شبانہ روز سے کم کا ہو تو عورت بلا محرم جا سکتی ہے، لیکن اگر تین دن یا اس سے زائد کا سفر ہو تو شوہر یا محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوری کا یہی مذہب ہے۔

(۳) جو عورت شوہر یا محرم نہ رکھتی ہو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ جا سکتی ہے جن کی اخلاقی حالت قابلِ اطمینان ہو۔ یہ ابنِ سیرینؒ، عطا، زہریؒ، قتادہ اور اوزاعی رحمہم اللہ کا مسلک ہے اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام شافعیؒ نے "قابلِ اطمینان رفیقوں" کی مزید تشریح اس طرح کی ہے کہ اگر چند عورتیں بھروسے کے قابل ہوں اور وہ اپنے محرموں کے ساتھ جا رہی ہوں تو ایک بے شوہر اور بے محرم عورت ان کے ساتھ جا سکتی ہے۔ البتہ صرف ایک عورت کے ساتھ اُسے نہ جانا چاہیئے۔

(۴) ان سب کے خلاف ابنِ حزمؒ ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ بے محرم عورت کو تنہا ہی حج کے لیے جانا چاہیئے۔ اگر وہ شوہر رکھتی ہو اور وہ اُسے نہ لے جائے تو شوہر گنہ گار ہو گا مگر عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے بغیر حج کو چلی جائے۔

میں ان چاروں مسالک میں سے تیسرے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس میں ایک دینی فریضہ کو ادا کرنے کی گنجائش بھی ہے، اور اُس فتنے کا احتمال بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث میں عورت کے بلا محرم سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ ۔ ستمبر ۱۹۵۲ء)

وراثت میں اخیافی بھائی بہنوں کا حصہ

سوال :-

قدوری (کتاب الفرائض، باب الحجب) میں یہ عبارت درج ہے
او تترك المرأة زوجا واما اوجدة واخوة من ام واخاً
من اب وام فلزوج النصف وللام السدس ولاولاد الام
الثلث ولاشئ لاخوة للاب والام۔ یعنی اگر ایک عورت
کے وارثوں میں اُس کا شوہر اور ماں یا دادی اور اخیافی (ماں شریک) بھائی
اور سگا بھائی موجود ہوں تو شوہر کو آدھا حصہ، ماں کو چھٹا حصہ اور اخیافی
بھائی بہنوں کو ایک تہائی حصہ ملے گا اور سگے بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔
دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ احناف کا مفتیٰ بہ قول ہے؟ کیا یہ قرینِ
انصاف ہے کہ برادرِ حقیقی تو محروم ہو جائے اور اخیافی (یعنی ماں جائے)
بھائی بہن چھوڑے، تو حصر کی قانونی تعریف بھی واضح فرمائیں۔ کیا والدہ
اور دادی کے زندہ ہونے کے باوجود ایک میت کو کلالہ قرار دیا جا
سکتا ہے؟

جواب :-

قدوری سے جو مسئلہ آپ نے نقل کیا ہے، اس میں سلف کے مابین اختلاف
ہے۔ اگر کوئی عورت مرجائے اور پیچھے شوہر، ماں سگے بھائی بہن اور اخیافی
(یعنی ماں جائے) بھائی بہن چھوڑے، تو حضرت علیؓ، ابوموسیٰ اشعری اور اُبی ابن

کعب رضی اللہ عنہم کا فتویٰ یہ ہے کہ اُس کی نصف میراث شوہر کو، ۱/۶ ماں کو اور ۱/۳ اخیافی بھائی بہنوں کو دیا جائے گا اور سگے بھائی بہنوں کو کچھ نہ ملے گا۔ اسی فتویٰ کو علمائے احناف نے لیا ہے اور یہی ان کا مفتیٰ بہ قول ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابت کا یہ مذہب ہے کہ ۱/۳ میراث سگے اور اخیافی بھائی بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی جائے گی۔ حضرت عمرؓ پہلے قولِ اوّل کے قائل تھے مگر بعد میں انہوں نے قولِ ثانی اختیار کر لیا۔ ابن عباسؓ سے دو روایتیں مروی ہیں، مگر زیادہ معتبر روایت یہی ہے کہ وہ بھی قولِ ثانی کے قائل تھے۔ اسی پر قاضی شریح نے فیصلہ کیا ہے اور امام شافعیؒ، امام مالک اور سفیان ثوری رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ اخیافی بھائی بہن ذوی الفروض ہیں اور سگے بھائی عصبات ہیں، اور ذوی الفروض کا حق عصبات پر مقدم ہے، لہٰذا جب ذوی الفروض سے کچھ نہ بچے تو عصبات کو کوئی حق نہ پہنچے گا۔

دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ ماں جائے ہونے میں جب سگے اور اخیافی بھائی بہن یکساں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ برابر کے حصے دار نہ ہوں۔

کلالہ کے جو معنی حضرت ابوبکرؓ نے بیان فرمائے ہیں اور جنہیں حضرت عمرؓ نے بھی قبول کیا ہے، من لا ولد لہ ولا والد۔ یعنی کلالہ وہ ہے جس کی اولاد ہو اور نہ باپ۔ اسی طرح ماں یا دادی کی موجودگی کسی میت کے کلالہ ہونے میں مانع نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ۔ ستمبر ۱۹۵۲ء)

محرمات کی حرمت کے وجوہ

سوال :-

چند روز سے رفقاء کے درمیان محرمات کے سلسلے میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے جو میں ذیل میں تحریر کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ از راہِ کرم اس پر روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں گے۔

مناکحت کے سلسلے میں ایک عورت اور دوسری عورت میں کیوں تمیز کیا گیا ہے کہ بعض کو عقد میں لایا جا سکتا ہے اور بعض محرمات کی فہرست میں آتی ہیں؟ اگرچہ ابتدائے انسانیت میں ایسی کوئی قید نظر نہیں آتی ہے جیسا کہ ہابیل اور قابیل کے قصے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ کیا اس قسم کی شادیاں حیاتیاتی مفاسد کا موجب بھی بن سکتی ہیں؟

امید ہے کہ آپ اس کا جواب ترجمان القرآن میں شائع فرمادیں گے تاکہ دیگر حضرات کے لیے بھی استفادہ کا باعث ہو۔

جواب :-

محرمات کی فہرست میں جن عورتوں کو شامل کیا گیا ہے، ان کے حرام ہونے کی ہونے کی اصل وجہ حیاتیاتی حقائق نہیں ہیں بلکہ اخلاقی اور معاشرتی حقائق ہیں۔ آپ خود غور کریں کہ جس ماں کے شہوانی جذبات بھی اپنے بیٹے سے متعلق ہو سکتے ہوں کیا وہ اُن پاکیزہ و مطہر جذبات کے ساتھ بیٹے کو پال سکتی ہے جو ماں اور بیٹے کے تعلقات میں ہونے چاہئیں؟ اور کیا بیٹا ہوش سنبھالنے کے بعد ماں کے ساتھ

وہ معصومانہ بے تکلفی برت سکتا ہے اور بیٹے کے درمیان اب ہوتی ہے ؟

اور کیا ایک گھر میں باپ اور بیٹے کے درمیان رقابت اور حسد کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں گے اگر ماں اور بیٹے کے درمیان ابدی حرمت کی دیوار حائل نہ ہو؟

ایسا ہی معاملہ بہن اور بھائی کا بھی ہے ۔ اگر ابدی حرمت ان کے درمیان قائم نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ بھائی بہن ایک دوسرے کے ساتھ معصوم روابط اور شہوات سے پاک محبت اور شبہات سے بالاتر بے تکلفی برت سکتے ؟ کیا اس صورت میں بھی یہ ممکن ہوتا کہ والدین اپنے بیٹوں کو سن بلوغ کے قریب پہنچنے پر ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش نہ کرتے ؟ اور کیا کوئی شخص بھی کسی لڑکی سے شادی کرتے وقت یہ اطمینان کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں سے بچی ہوئی ہوگی ؟

پھر اگر خسر اور بہو کے درمیان، اور ساس اور داماد کے درمیان ابدی حرمت کی دیواریں حائل نہ کر دی جاتیں تو کس طرح ممکن تھا کہ باپ اور بیٹے اور ماں اور بیٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ رقیبانہ کشمکش میں مبتلا ہونے اور ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھنے سے بچ جائیں ؟

اس پہلو پر اگر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ شریعت نے کن اہم اخلاقی و معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر اُن تمام مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے لیے حرام کر دیا ہے جن کے درمیان ایک گھر، ایک خاندان اور ایک دائرۂ معاشرت کے اندر قریب ترین روابط اور بے تکلف روابط فطرتاً ہوتے ہی اور معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ہونے چاہئیں ۔ بیٹے اور بیٹیاں پل ہی نہیں سکتیں اگر ماں اور باپ دونوں اس طرف سے بالکل مطمئن، نہ

ہوں کہ ان میں سے کسی کا بھی کوئی شہوانی علاقہ اپنی اولاد کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک ہی گھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کا پلنا غیر ممکن ہو جائے۔ اگر بہن کے معاملہ میں بھائیوں کے درمیان اور بھائی کے معاملہ میں بہنوں کے درمیان شہوانی رقابتیں پیدا ہونے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ ہو۔ خالائیں اور پھوپھیاں اور چچا اور ماموں اگر شبہ سے بالاتر نہ کر دیئے جائیں تو بہن اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے اور بھائی اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے بچانے کی فکر میں لگ جائیں۔

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ۔ ستمبر ۱۹۵۱ء)

عورتوں میں ہم جنسیت

سوال :-

ان دنوں زنانہ کالجوں کی مسموم فضا میں لڑکیوں کے اندر عجیب وبائیں پھیل رہی ہیں۔ بالعموم دو لڑکیوں کی دوستی خلوص اور محبت کی حدوں سے گزر کر جنسی محبت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ شرعاً یہ کس درجے کا گناہ ہے؟ کبیرہ یا صغیرہ؟

جواب :-

مرد اور مرد کی جنسی محبت جتنا بڑا گناہ ہے، عورت اور عورت کی محبت بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ اخلاقی حیثیت سے ان دونوں میں نہ نوعیت کا فرق ہے اور نہ درجے کا۔ افسوس ہے کہ یہ نام نہاد "ادب لطیف" جو رسالوں اور

افسانوں اور ناولوں کی شکل میں گھر گھر پہنچ رہا ہے، اور یہ فحش تصویریں اور فلم جنہیں آزادی کے ساتھ مردوں کی طرح عورتیں بھی دیکھ رہی ہیں، اور یہ اختلاط مرد وزن جس کو روز بروز ہماری سوسائٹی میں فروغ نصیب ہو رہا ہے، ان ساری چیزوں نے مل جل کر نوجوان مردوں کی طرح نوجوان لڑکیوں کو بھی غیر معمولی جذباتی ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے۔ شہوانی جذبات کی ایک بھٹی ہے جو سینوں میں بھڑکا دی گئی ہے اور بہت سی دھونکنیاں ہر آن اسے زیادہ اور زیادہ بھڑکانے میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بگاڑ اب تک زیادہ تر مردوں میں پایا جاتا تھا، وہ ایک وبا کی طرح شریف گھروں کی لڑکیوں اور درسگاہوں کی طالبات اور استانیوں میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا ہے۔ جن خواتین کو زنانہ درسگاہوں کے حالات قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ان کی اطلاع یہ ہے کہ آج لڑکیوں میں جو بے حیائی، بیباکی، جنسی مسائل پر کھلی کھلی گفتگو کرنے کی جرأت اور جنسی رجحانات ——— فطری اور غیر فطری، ہر دو طرح کے رجحانات ——— کے اظہار و اعلان کی عام جسارت پائی جاتی ہے، چند سال پہلے تک اس کا تصور کرنا مشکل تھا۔ اب لڑکیوں میں یہ چرچے عام ہو رہے ہیں کہ کونسی صاحبزادی کس استانی کی منظورِ نظر ہیں، اور کونسی صاحبزادی کس دوسری صاحبزادی کے عشق میں مبتلا ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!

لطف یہ ہے کہ اس جہنم کی طرف جو لوگ اپنی قوم کو دھکیل رہے ہیں، وہ اپنی اب تک کی کوششوں کے نتائج سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں حسرت یہ ہے کہ کاش ملا کی مخالفت و مزاحمت راہ میں حائل نہ ہوتی تو وہ ترقی کے مزید قدم ذرا جلدی

جلدی اٹھا سکتے ہیں!

(ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۱۳۷۱ھ۔ جون، جولائی ۱۹۵۲ء)

نیک چلنی کا انوکھا تصور

سوال:۔

میں نے ایک دوشیزہ کو لالچ دیا کہ میں اُس سے شادی کروں گا۔ پھر اس کے ساتھ خلافِ اخلاق تعلقات رکھے۔ میں نہایت دیانت داری سے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس لڑکی کے خاندان کی عام عورتیں زانیہ اور بدکار ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کی ماں بھی۔ اب مجھے خوف ہے کہ اگر میں اس لڑکی سے شادی کروں تو وہ بھی بدچلن ثابت نہ ہو۔ ترجمان القرآن کے ذریعہ سے مطلع کیجئے کہ مجھے کیا کرنا چاہئیے۔

جواب:۔

یہ ایک گمنام خط ہے جو ہمیں حال میں موصول ہوا ہے۔ عموماً گمنام خطوط جواب کے مستحق نہیں ہوا کرتے۔ لیکن اس کا جواب اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ہماری بدقسمت سوسائٹی میں اس وقت بہت سے ایسے نوجوان موجود ہیں جن کے اندر سائل کی سی ذہنیت پائی جاتی ہے۔ خود بدکار ہیں مگر شادی کے لیے کوئی ایسی لڑکی چاہتے ہیں جو عفیفہ ہو۔ جس ظرف کو انہوں نے خود گندہ کیا ہے، اُسے دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لیے کوئی ایسا ظرف تلاش کرتے ہیں

جیسے کسی نے گندہ نہ کیا ہو۔

جنابِ سائل سے گزارش ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے خود شادی سے پہلے خراب کیا ہے اس کے لیے اب آپ سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا ہے؟ اور وہ آپ سے زیادہ اور کس کے لیے موزوں ہو سکتی ہے؟ آپ کو اپنے لیے نیک چلن لڑکی کیوں درکار ہے جب کہ آپ خود بد چلن ہیں؟ جب اس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنے جسم کو آپ کے حوالے کیا تھا کیا اسی وقت آپ کو یہ معلوم نہ ہو گیا تھا کہ وہ بد چلن ہے؟ پھر آپ کو اب یہ اندیشہ کیوں لاحق ہوا کہ آگے چل کر وہ کہیں بد چلن ثابت نہ ہو؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے ملوث ہونا تو نیک چلنی ہے اور بد چلنی صرف دوسروں سے ملوث ہونے کا نام ہے؟ پھر اس کے خاندان کی عورتوں پر آپ کا اعتراض بھی عجیب ہے۔ وہ خواتینِ کرام جیسی کچھ بھی ہیں، اسی لیے ہیں کہ آپ جیسے معزز اصحاب سے ان کو سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ آپ اگر اس راہ پر بعد میں آئے ہیں تو آخر اپنے پیش روؤں کے انجام دیئے ہوئے کارناموں سے اس درجہ نفرت کیوں ظاہر فرماتے ہیں؟ بُرا نہ مانیئے، آپ دانستہ یا نادانستہ ٹھیک اسی خاندان میں پہنچ گئے ہیں جس کے لیے آپ موزوں ترین ہیں اور جو آپ کے لیے موزوں ترین ہے۔ کسی دوسرے پاکیزہ خاندان کو خراب کرنے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ آپ اسی خاندان میں پھنسے جائیں جس کو آپ جیسے لوگ خراب کر چکے ہیں، اور جسے خراب کرنے میں آپ کا حصہ بھی شامل ہے۔

آخر میں محترم سائل کو قرآن کی دو آیتیں بھی سُن لینی چاہئیں۔ پہلی آیت یہ

ہے:

الزانی لا ینکح الا زانیۃ اومشرکۃ والزانیۃ لا ینکحھا الا زان اومشرک وحرم ذالک علی المومنین

(النور۔)

زانی مرد نکاح نہیں کیا کرتا مگر ایک زانیہ یا مشرکہ عورت سے، اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کیا کرتا مگر ایک زانی اور مشرک اور ایسا کرنا مومنین پہ حرام ہے۔

اس آیت میں " نکاح نہیں کیا کرتا " سے مطلب یہ ہے کہ زانی مرد اس لائق نہیں ہے کہ اس کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے سوا کسی اور سے ہو۔ اور زانیہ عورت کے لیے اگر کوئی شخص موزوں ہے تو زانی یا مشرک مرد، نہ کہ کوئی مومن صالح۔

دوسری آیت یہ ہے:

الخبیثت للخبیثین والخبیثون للخبیثت ج و الطیبٰت للطیبین والطیبون للطیبت۔

بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لیے ہیں اور بدکار مرد بدکار عورتوں کے لیے۔ اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ۔ جنوری، فروری ۱۹۵۱ء)

نیکی بھی عیب ہے!

سوال:

مجھے آپ کی تحریک سے ذاتی طور پہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ میری ایک بہن آپ کی جماعت میں شامل ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جون بدل گئی ہے۔ ہر وقت نماز، تسبیح، وعظ اور نصیحت سے کام ہے۔ گھر کے افراد کو زبردستی آپ کا ترجمۂ قرآن سناتی ہے۔ اگرچہ تعلیم یافتہ ہے لیکن خیالات کے اعتبار سے وہ موجودہ زمانہ کی لڑکی نہیں رہی۔ لباس سادہ اور سفید پہنتی ہے۔ جس دن دل چاہے روزہ رکھ لیتی ہے۔ میں اس کے اس طرز سے نہایت پریشان ہوں۔ رشتہ داروں میں جو سنتا ہے وہ اس لیے رشتہ پہ آمادہ نہیں ہوتا کہ رات دن وعظ کون سنے۔ پرسوں میری خالہ آئی تھیں، ان کو بھی یہ نصیحت کرنے لگیں۔ چند کتابیں اور ایک کیلنڈر آپ کے ہاں کا انہیں دے ہی دیا۔ کل اتوار تھا۔ ہم لوگ سیر کے لیے گئے، اس سے بہت کہا مگر یہ نہیں گئی۔ بالکل ولیوں کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے اس ماحول میں آخر کس طرح گنجائش پیدا کی جائے۔ نہ تو اس کی شادی اس طرح ہو سکتی ہے اور نہ اس کے خیالات بدلنا میرے یا کسی کے بس میں ہے۔ اگر اس سے کچھ کہا سنا جائے تو رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟

جواب :-

اس معاملے میں میں خود بھی بے بس ہوں۔ آپ اپنے طور پر ہی کوشش کریں کہ آپ کی ہمشیرہ اسلام سے توبہ کر لیں۔

(ترجمان القرآن۔ شعبان، رمضان ۱۳۷۲ھ۔ مئی، جون ۱۹۵۳ء)

متفرق مسائل

بیمہ کا جواز و عدمِ جواز

سوال :-

انشورنس کے مسئلے میں مجھے تردد لاحق ہے ، اور صحیح طور پہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ آیا بیمہ کرانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا ناجائز ! اگر بیمے کا موجودہ کاروبار ناجائز ہو تو پھر اسے جائز بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں ۔ اگر موجودہ حالات میں ہم اسے ترک کر دیں تو اس کے نتیجے میں معاشرے کے افراد بہت سے فوائد سے محروم ہو جائیں گے ۔ دنیا بھر میں یہ کاروبار جاری ہے ۔ ہر قوم وسیع پیمانے پر انشورنس کی تنظیم کر چکی ہے اور اس سے مستفید ہو رہی ہے ۔ مگر ہمارے ہاں ابھی تک اس بارے میں تامل اور تذبذب پایا جاتا ہے آپ اگر اس معاملے میں صحیح صورت تک رہنمائی کریں تو ممنون ہونگا ۔

جواب :-

انشورنس کے بارے میں شریعِ اسلامی کی رُو سے تین اصولی اعتراضات ہیں جن کی بناپر اسے جائز نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔

اوّل یہ کہ انشورنس کمپنیاں جو روپیہ (Premium) کی شکل میں وصول کرتی ہیں اس کے بہت بڑے حصّے کو سُودی کاموں میں لگاکر فائدہ حاصل کرتی ہیں اور اس ناجائز کاروبار میں وہ لوگ آپ سے آپ حصّہ دار بن جاتے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اپنے آپ کو یا اپنی کسی چیز کو ان کے پاس انشور کراتے ہیں۔

دوم یہ کہ موت یا حوادث یا نقصان کی صورت میں جو رقم دینے کی ذمّہ داری کمپنیاں اپنے ذمّہ لیتی ہیں اس کے اندر قمار کا اصول پایا جاتا ہے۔

سوم یہ کہ ایک آدمی کے مرجانے کی صورت میں جو رقم ادا کی جاتی ہے، اسلامی شریعت کی رُو سے اس کی حیثیت مرنے والے کے ترکے کی ہے۔ جسے شرعی وارثوں میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ مگر یہ رقم ترکے کی حیثیت میں تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ اُس شخص یا ان اشخاص کو مل جاتی ہے جن کے لیے پالیسی ہولڈر نے وصیت کی ہو۔ حالانکہ وارث کے حق میں شرعاً وصیت ہی نہیں کی جاسکتی۔

رہا یہ سوال کہ انشورنس کے کاروبار کو اسلامی اصول پر کس طرح چلایا جاسکتا ہے، تو اس کا جواب اتنا آسان نہیں جتنا یہ سوال آسان ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ماہرین کی ایک مجلس جو اسلامی اصُول کو بھی جانتی ہو اور انشورنس کے معاملات کو بھی سمجھتی ہو، اس پورے مسئلے کا جائزہ لے اور انشورنس کے

کاروبار میں ایسی اصلاحات تجویز کرے جن سے کاروبار بھی چل سکتا ہو اور شریعت کے اصولوں کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہمیں کم از کم یہ تسلیم تو کرنا چاہیئے کہ ہم ایک غلط کام کر رہے ہیں۔ غلطی کا احساس بھی اگر ہم میں باقی نہ رہے تو پھر اصلاح کی کوشش کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

بے شک موجودہ زمانے میں انشورنس کی بڑی اہمیت ہے، اور ساری دنیا میں اس کا چلن ہے۔ مگر نہ اس دلیل سے کوئی حرام چیز حلال ہو سکتی ہے اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب حلال ہے یا اسے اس بنا پر حلال ہونا چاہیئے کہ دنیا میں اس کا چلن ہے۔ ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم جائز و ناجائز میں فرق کریں اور اپنے معاملات کو جائز طریقوں سے چلانے پر اصرار کریں۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۶۲ء)

اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل

سوال:۔

کیا اس دور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی معاشی و معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی جبکہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس نے تاریک ترین دور میں بھی عورت کو ایک مقام (Status) عطا کیا؟ کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے ورثہ کا حصہ لینے کا

حق دیا جا سکتا ہے ؟ کیا ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم یا مردوں سے شانہ بشانہ کام کر کے ملک و قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہوگی ! فرض کیجئے اگر اسلامی حکومت خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرت آراء سے وزارت و صدارت کے عہدوں کے لیے الیکشن لڑ کر کامیاب ہو جائیں تو موجودہ بیسوی صدی میں بھی کیا ان کو منصب اعلیٰ کا حق اسلامی احکام کی رو سے نہیں مل سکتا جبکہ بہت سی مثالیں آج موجود ہیں مثلاً سیلون میں وزارت عظمیٰ ایک عورت کے پاس ہے یا نیدرلینڈ میں ایک خاتون ہی حکمران اعلیٰ ہے ۔ برطانیہ پر ملکہ کی شہنشاہیت ہے سفارت تک جیسے عابدہ سلطانہ دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہے اور اب بیگم رعنا لیاقت علی خاں نیدرلینڈ میں سفیر ہیں ۔ یا دیگر جس طرح مسز وجے لکشمی پنڈت برطانیہ میں ہائی کمشنر ہیں ۔ اور اقوام متحدہ کی صدر رہ چکی ہیں ۔ اور بھی مثالیں جیسے نور جہاں جھانسی کی رانی رضیہ سلطانہ، حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ (Pride of Woman) کہلاتی ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لکھنؤ میں جنگ کی کمانڈ کی ۔ اس طرح خواتین نے خود کو پورا اہل ثابت کر دیا ہے ۔ تو کیا اگر آج محترمہ فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت نہ دیں گے ؟ کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر، وکلاء، مجسٹریٹ جج فوجی افسر یا پائلٹ وغیرہ بننے کی مطلق اجازت نہ ہوگی ؟ خواتین

کا یہ بھی کارنامہ کردہ نرسوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں قابلِ ذکر ہے ۔ خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے مرہم پٹی کی، پانی پلایا اور حوصلے بلند کیے ۔ تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدھی قوم کو مکانات کی چار دیواری میں مقید رکھا جائے گا ؟

جواب :۔

اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے، اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں ۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں ۔ آخرت میں اپنے اجر کے لحاظ سے برابر ہیں ۔ لیکن دونوں کا دائرۂ عمل ایک نہیں ہے ۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرۂ عمل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ یا تو ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو جائے گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں ۔ یا پھر عورتوں پر دہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں ۔ عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے ۔ لازماً پہلی صورت

ہی رونما ہو گی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آنکھیں بند کر کے دوسری کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقل مندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصّہ مرد کے برابر ہو۔ کیونکہ اسلامی احکام کی رو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی بار مرد پہ ڈالا گیا ہے۔ بیوی کا مہر اور نفقہ بھی اس پہ واجب ہے اس کے مقابلے میں عورت پہ کوئی مالی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس صورت میں آخر عورت کو برابر کے برابر حصّہ کیسے دلایا جاسکتا ہے۔

اسلام اصولاً مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کے استحکام کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں تو شوق سے بھگتتے رہیں لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں اُن افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پہ عورتوں سے مرہم پٹی کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لا کھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرہ عمل میں آکر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ وہ ان کاموں کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لیے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کیے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور

پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو ان کا دہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرہ عمل میں جس کے لیے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نا اہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہے کیا وہاں تمام خواتین موزوں ہو سکیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری محکموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی بہ نسبت ۵۵ فیصد سے زیادہ نہیں۔ پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ عورتوں کے پاس پہنچ کر کوئی راز راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورتوں کا دخل ہوتا ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلوائی جانی چاہیے، لیکن چند شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی جائے جس سے وہ اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے لیے ٹھیک ٹھیک تیار

ہو سکیں اور ان کی تعلیم بعینہٖ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو۔ دوسرے یہ کہ تعلیم مخلوط نہ ہو اور عورتوں کو زنانہ تعلیم گاہوں میں عورتوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے۔ مخلوط تعلیم کے مہلک نتائج مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آچکے ہیں کہ اب صرف عقل کے اندھے ہی ان کا انکار کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے امریکہ میں ۱۶ سال تک عمر کی لڑکیاں جو ہائی سکولوں میں پڑھتی ہیں مخلوط تعلیم کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اوسطاً ایک ہزار حاملہ نکلتی ہیں گو ابھی یہ شکل ہمارے ہاں رونما نہیں ہوئی ہے لیکن اس مخلوط تعلیم کے نتائج سامنے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سے ایسے اداروں میں کام لیا جائے جو صرف عورتوں کے لیے ہی مخصوص ہوں مثلاً زنانہ تعلیم گاہیں اور زنانہ ہسپتال وغیرہ۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۶۲ء)

بے حیائی کے مظاہر اور قانونِ اسلام

سوال:۔

کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی؟ جیسے ان کی زیبائش اور نیم عریاں لباس زیب تن کرنے اور فیشن کا رجحان اور جیسے آج کل نوجوان لڑکیاں نہایت تنگ سینٹ سے معطر لباس اور غازہ و سرخی سے مزین اپنے ہر

خدوخال اور نشیب و فراز کی نمائش برسرِ عام کرتی ہیں اور آج کل نوجوان لڑکے بھی بالی وڈ فلموں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائے بن رہے ہیں۔ تو کیا حکومت قانون Legislation کے ذریعے ہر مسلم و غیر مسلم لڑکے اور لڑکی کے آزادانہ رجحان کو روکے گی! خلاف ورزی پہ سزا دے گی والدین و سرپرستوں کو جرمانہ کیا جا سکے گا! تو اس طرح کیا ان کی شہری آزادی پہ ضرب نہ لگے گی! کیا گرلز گائیڈ، اپوا (APWA) یا دیگر وائی، ایم، سی، اے (YMCA) اور وائی، ڈبلیو، سی، اے (YWCA) جیسے ادارے اسلامی نظام میں گوارا کیے جا سکتے ہیں؟ کیا خواتین اسلامی عدلیہ سے خود طلاق لینے کی مجاز ہو سکیں گی اور مردوں پہ ایک سے زیادہ شادی کی پابندی آج جائز ہو گی؟ یا خواہ اسلامی عدالت کے روبرو ہی ان کو اپنی پسند سے (Civil Marriage) کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا خواتین کو لیوتہ فیسٹیوں، کھیلوں، نمائش، ڈراموں ناچ، فلموں یا مقابلہ حسن میں شرکت یا (Air Hostess) وغیرہ بننے کی آج بھی اسلامی حکومت مخالفت کرے گی۔ ساتھ ہی قومی کردار تباہ کرنے والے مثلاً سینما، فلمیں، ٹیلی ویژن، ریڈیو پہ فحش گانے یا عریاں رسائل و لٹریچر، موسیقی، ناچ و رنگ کی ثقافتی محفلیں وغیرہ کو بند کر دیا جائے گا یا فائدہ اٹھانا ممکن ہو گا؟

جواب :-

اسلام معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا سارا کام محض قانون کے ڈنڈے سے نہیں لیتا، تعلیم، نشرواشاعت اور رائے عام کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ جائے تو اسلام قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ عورتوں کی عریانی اور بے حیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی بھی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری تدابیر اصلاح سے درست نہ ہو یا اس کا وجود باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو ازروئے قانون روکنا پڑے گا۔ اس کا نام اگر شہری آزادی پہ ضرب لگانا ہے تو جواریوں کو پکڑنا اور جیب کتروں کو سزائیں دینا بھی شہری آزادی پہ ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ اجتماعی زندگی لازماً افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔ افراد کو اس کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور دوسروں سے سیکھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرہ کو خراب کریں۔

گرلز گائیڈ (Girl Guidas) کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

اپوا (APWA) قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال کرنا چھوڑ دے۔

(YMCA) عیسائی عورتوں کے لیے رہ سکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مسلمان عورتیں اگر چاہیں تو (YWMA) بنا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلامی حدود میں رہیں۔

مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعے سے خلع کر سکتی ہے۔ فسخ نکاح
(Nullification) اور تفریق (Judicial Separation
کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ
قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری عدالت سے حاصل کرنے کی مجاز ہو۔
لیکن طلاق (Divorce) کے اختیارات قرآن نے صریح الفاظ میں صرف
مرد کو دیئے ہیں اور کوئی قانون مردوں کے اس اختیار میں مداخلت نہیں کر
سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف قوانین بنا لئے
جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخ عہد رسالت ؐ سے لے کر اس صدی تک اس
تصور سے ناآشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مرد سے سلب کر لیا جائے
اور کوئی عدالت یا پنچائت اس میں دخل دے۔ یہ تخیل سیدھا یورپ سے
چل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے کبھی
آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانون طلاق کا پس منظر
(Background) کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے بڑے نتائج
رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکینڈل نکل کر بازاروں میں
پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے گا کہ خدا کے قوانین میں ترمیم کے کیا نتائج
ہوتے ہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں ازروئے قانون پابندی
عائد کرنے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تخیل بھی ایک بیرونی مال ہے جسے
قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے۔ یہ اُس سوسائٹی میں سے آیا ہے

جس میں ایک ہی عورت اگر منکوحہ بیوی کی موجودگی میں داشتہ کے طور پہ رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابلِ برداشت ہے بلکہ اس کے حرامی بچوں کے حقوق محفوظ کرنے کی بھی فکر کی جاتی ہے (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے)، لیکن اگر اسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے۔ گویا ساری پابندیاں حلال کے لیے ہیں، حرام کے لیے نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ابجد سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار (Values) اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانوناً جائز اور نکاح قانوناً حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں زنا کا رواج بڑھے گا۔ گرل فرینڈز اور داشتائیں (Mistresses) فروغ پائیں گی اور دوسری بیوی ناپید ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسی سوسائٹی ہوگی جو اپنے خدوخال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہوگی۔ اس صورتِ حال کے تصور سے جس کا جی چاہے مطمئن ہو۔ مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو کسی مشرک عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں یا کسی ایسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور مسلمان مرد اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہوگا۔

یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہے تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اس کی اجازت دے؟ اور ایک اسلامی عدالت کا یہ کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کروائے۔

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یوتھ فیسٹیول (Youth Festival) اور کھیلوں کی نمائشوں اور ڈراموں اور رقص و سُرود اور مقابلۂ حُسن میں مسلمان عورتوں کو لائے یا ایئر ہوسٹس (Air Hostess) بنا کر مسافروں کے دل موہنے کی خدمت اِن سے لے تو ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلامی حکومت کی آخر ضرورت کیا ہے۔ یہ سارے کام تو کفر اور کفار کی حکومت میں بآسانی ہوسکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہوسکتے ہیں۔

سینما، فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں۔ خرابی اُن کے استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والا ہے۔ اسلامی حکومت کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کرے اور اخلاقی فساد کے لیے استعمال ہونے کا دروازہ بند کردے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۷۔ عدد ۴۔ جنوری ۶۲ء)

فتنہ تصویر

سوال :۔

آج کل تصویروں اور فوٹو گرافی کا استعمال کثرت سے ہے۔ زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ان کا استعمال ایک تہذیبی معیار بن گیا ہے۔ بازار کی دکانوں میں، مکانوں کے ڈرائنگ روموں میں، رسالوں کے سرورق پر، اخباروں کے کالموں میں، غرضیکہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے اس لعنت سے سابقہ پڑتا ہے اور بعض اوقات توجہ مبذول ہو کے رہتی ہے۔ کیا نسوانی تصویروں کو بھی پوری توجہ کے ساتھ دیکھنا گناہ ہے۔

جواب :۔

تصویروں کا فتنہ فی الواقع ایک بلائے عام بلکہ سیلاب بلا کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کا کوئی علاج میرے علم میں اس کے سوا نہیں ہے کہ بحیثیت مجموعی نظامِ زندگی میں تغیر واقع ہو اور اس نظام کی زمام کار ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو معاشرے میں تمام منکرات کے ظہور کو روک دیں۔ جب تک یہ سیلاب امنڈ رہا ہے، جو شخص جس حد تک بھی اس سے بچ سکتا ہو بچنے کی کوشش کرے۔ نسوانی تصویروں کے ساتھ بھی وہی غض بصر کا معاملہ کرنا چاہیئے جو خود عورتوں کے لیے شریعت نے لازم کیا ہے، کیونکہ جیتی جاگتی عورت کو گھورنے اور اس کی تصویر کو دیکھنے کے اثرات و نتائج قریب قریب یکساں

ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۵۔ اگست ۱۹۵۹ء)

رشوت اور اضطرار

سوال:۔

(۱) حالتِ اضطرار کیا ہے؟ کیا اضطرار کے بھی حالات اور ماحول کے لحاظ سے مختلف درجات ہیں!

(۲) موجودہ حالات اور موجودہ ماحول میں کیا مسلمانوں کے لیے کسی صورت میں بھی رشوت جائز ہو سکتی ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے رشوت کی ایک جامع تعریف بھی بیان کر دیجیے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس قسم کے معاملات رشوت کی تعریف میں آتے ہیں۔

جواب:۔

اضطرار یہ ہے کہ آدمی کو شریعت کی مقرر کی ہوئی حدود سے کسی حد پہ قائم رہنے میں ناقابلِ برداشت نقصان یا تکلیف لاحق ہو۔ اس معاملہ میں آدمی اور آدمی کی قوتِ برداشت کے درمیان بھی فرق ہے اور حالات اور ماحول کے لحاظ سے بھی بہت کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کون شخص کس وقت کن حالات میں مضطر ہے، خود اُس شخص کا کام ہے

جو اس حالت میں مبتلا ہو اُسے خود ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور آخرت کی جوابدہی کا احساس کرتے ہوئے یہ رائے قائم کرنی چاہیئے کہ آیا وہ واقعی اس درجہ مجبور ہو گیا ہے کہ خدا کی کوئی حد توڑ دے ؟

موجودہ حالات ہوں یا کسی اور قسم کے حالات، رشوت لینا تو بہرحال حرام ہے۔ البتہ رشوت دینا صرف اس صورت میں بربنائے اضطرار جائز ہو سکتا ہے جبکہ کسی شخص کو کسی ظالم سے اپنا جائز حق حاصل نہ ہو رہا ہو اور اس حق کو چھوڑ دینا اس کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچاتا ہو اور اوپر کوئی بااختیار حاکم بھی ایسا نہ ہو جس سے شکایت کر کے اپنا حق وصول کرنا ممکن ہو۔

رشوت کی تعریف یہ ہے کہ "جو شخص کسی خدمت کا معاوضہ پاتا ہو وہ اسی خدمت کے سلسلے میں اُن لوگوں سے کسی نوعیت کا فائدہ حاصل کرے جن کے لیے یا جن کے ساتھ اس خدمت کے سلسلے میں اُن لوگوں معاملات انجام دینے کے لیے وہ مامور ہو، قطعِ نظر اس سے کہ وہ لوگ برضا و رغبت اسے وہ فائدہ پہنچائیں یا مجبوراً۔" جو عہدہ دار یا سرکاری ملازمین تحفے تحائف کو اس تعریف سے خارج ٹھیرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر وہ تحفہ ناجائز ہے جو کسی شخص کو ہرگز نہ ملتا اگر وہ اس منصب پر نہ ہوتا۔ البتہ جو تحفے آدمی کو خالص شخصی روابط کی بنا پر ملیں، خواہ وہ اس منصب پر ہو یا نہ ہو، وہ بلاشبہ جائز ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۱۳۷۱ھ۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

اسلام اور سنیماٹوگرافی

سوال :-

میں ایک طالب علم ہوں ۔ میں نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ خدا کے فضل سے مجھ میں نمایاں ذہنی و عملی انقلاب رونما ہوا ہے ۔ مجھے ایک زمانے سے سینماٹوگرافی سے گہری فنی دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ نظریات کی تبدیلی کے بعد میری دلی خواہش ہے کہ اگر شرعاً ممکن ہو تو اس فن سے دینی و اخلاقی خدمت لی جائے ۔ آپ براہِ نوازش مطلع فرمائیں کہ اس فن سے استفادے کی گنجائش اسلام میں ہے یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر بھی واضح فرمائیں کہ عورت کا کردار پردۂ فلم پر دکھانے کی بھی کوئی جائز صورت ممکن ہے یا نہیں ؟

جواب :-

میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ سینما بجائے خود جائز ہے، البتہ اس کا ناجائز استعمال اس کو ناجائز کر دیتا ہے۔ سینما کے پردے پر جو تصویر نظر آتی ہے وہ دراصل "تصویر" نہیں بلکہ پرچھائیں ہے، جس طرح آئینے میں نظر آیا کرتی ہے، اس لیے وہ حرام نہیں رہا ۔ وہ عکس جو فلم کے اندر ہوتا ہے، تو وہ جب تک کاغذ یا کسی دوسری چیز پر چھاپ نہ لیا جائے(۱)، نہ اس پر تصویر کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ وہ ان کاموں میں سے کسی کام کے لیے

ستعمال کیا جاسکتا ہے جن سے باز رہنے کی خاطر شریعت میں تصویر کو حرام کیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے میرے نزدیک سینما بجائے خود مباح ہے۔

جہاں تک اس فن کو سیکھنے کا تعلق ہے، کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو اس سے منع کیا جائے۔ آپ کا اس طرف میلان ہے تو آپ اسے سیکھ سکتے ہیں، بلکہ اگر مفید کاموں میں لسے استعمال کرنے کا ارادہ ہو تو آپ اسے ضرور سیکھیں کیونکہ یہ قدرت کی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے بھی دوسری فطری طاقتوں کے ساتھ خدمتِ حق اور مقاصدِ خیر کے لیے استعمال کیا جائے۔ خدا نے جو چیز بھی دنیا میں پیدا کی ہے، انسان کی بھلائی کے لیے اور حق کی خدمت کے لیے پیدا کی ہے۔ یہ ایک بدقسمتی ہوگی کہ شیطان کے بندے تو اسے شیطانی کاموں کے لیے خوب استعمال کریں، اور خدا کے بندے لسے خیر کے کاموں میں استعمال کرنے سے پرہیز کرتے رہیں۔

اب رہا فلم کو اسلامی اغراض اور مفید مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سوال، تو اس میں شک نہیں کہ بظاہر ایسے معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی، اور تاریخی فلم بنانے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی جو فواحش اور جنسی ہیجانات، اور تعلیم جرائم سے پاک ہوں، اور جن کا اصل مقصد بھلائی کی تعلیم دینا ہو۔ لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں دو شدید قباحتیں ہیں جن کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔

اوّل یہ کہ کوئی ایسا معاشرتی فلم بنانا سخت مشکل ہے جس میں عورت کا سرے

سے کوئی پارٹ نہ ہو ۔ اب اگر عورت کا پارٹ رکھا جائے تو اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ۔ ایک یہ کہ اس میں عورت ہی ایکٹر ہو ۔ دوسرے یہ کہ اس میں مرد کو عورت کا پارٹ دیا جائے ۔ شرعاً ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے ۔

دوم یہ کہ کوئی معاشرتی ڈرامہ بہر حال ایکٹنگ کے بغیر نہیں بن سکتا ۔ اور ایکٹنگ میں ایک عظیم الشان اخلاقی خرابی یہ ہے کہ ایکٹر آئے دن مختلف سیرتوں اور کرداروں کا سوانگ بھرتے بھرتے بالآخر اپنا انفرادی کیرکٹر بالکل نہیں تو بڑی حد تک کھو بیٹھتا ہے ۔ اس طرح چاہے ہم فلمی ڈراموں کو معاشرے کی اصلاح اور اسلامی حقائق کی تعلیم و تبلیغ ہی کے لیے کیوں نہ استعمال کریں ، ہمیں بہر حال چند انسانوں کو اس بات کے لیے تیار کرنا پڑے گا کہ وہ ایکٹر بن کر اپنا انفرادی کیرکٹر کھو دیں ۔ یعنی دوسرے الفاظ میں اپنی شخصیت کی قربانی دیں ۔ میں نہیں سمجھتا کہ معاشرے کی بھلائی کے لیے ، یا کسی دوسرے مقصد کے لیے ، خواہ وہ کتنا ہی پاکیزہ اور بلند مقصد ہو ، کسی انسان سے شخصیت کی قربانی کا مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے ۔ جان ، مال ، عیش ، آرام ، ہر چیز تو قربان کی جا سکتی ہے اور مقاصد عالیہ کے لیے کی جانی چاہیئے ، مگر یہ وہ قربانی ہے جس کا مطالبہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بھی نہیں کیا ہے ، کجا کہ کسی اور کے لیے اس کا مطالبہ کیا جا سکے ۔

ان وجوہ سے میرے نزدیک سینما کی طاقت کو ڈراموں کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا ۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طاقت اور کس کام میں لائی جا سکتی ہے ؟

میرا جواب یہ ہے کہ ڈرامے کے سوا دوسری بہت سی چیزیں بھی ہیں جو فلم میں دکھائی جا سکتی ہیں، اور ڈرامے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید ہیں۔ مثلاً،

ہم جغرافی فلموں کے ذریعہ سے اپنے عوام کو زمین اور اس کے مختلف حصّوں کے حالات سے اتنی وسیع واقفیت بہم پہنچا سکتے ہیں کہ گویا وہ دنیا بھر کی سیاحت کر آئے ہیں۔ اسی طرح ہم مختلف قوموں اور ملکوں کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو دکھا سکتے ہیں جن سے ان کو بہت سے سبق بھی حاصل ہوں گے اور ان کا نقطۂ نظر بھی وسیع ہوگا۔

ہم علمِ ہیئت کے حیرت انگیز حقائق اور مشاہدات ایسے دلچسپ طریقوں سے پیش کر سکتے ہیں کہ لوگ شہوانی فلموں کی دلچسپیاں بھول جائیں، اور پھر یہ فلم اتنے سبق آموز بھی ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر توحید اور اللہ کی ہیبت کا سکہ بیٹھ جائے۔

ہم سائنس کے مختلف شعبوں کو سینما کے پردے پر اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ عوام کو ان سے دلچسپی بھی ہو، اور ان کی سائنٹفک معلومات بھی ہمارے اندر گرت بحثوں کے معیار تک بلند ہو جائیں۔

ہم صفائی اور حفظانِ صحت اور شہریت (Civics) کی تعلیم بڑے دلچسپ انداز سے لوگوں کو دے سکتے ہیں جس سے ہمارے دیہاتی اور شہری عوام کی محض معلومات ہی وسیع نہ ہوں گی بلکہ وہ دنیا میں انسانوں کی طرح جینے کا سبق بھی حاصل کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے مفید نمونے بھی لوگوں کو دکھا سکتے ہیں تاکہ وہ ان کے مطابق اپنے گھروں اور اپنی بستیوں اور

اپنے اجتماعی زندگی کو درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

ہم مختلف صنعتوں کے ڈھنگ، مختلف کارخانوں کے کام، مختلف اشیاء کے بننے کی کیفیت، اور زراعت کے ترقی یافتہ طریقے سنیما کے پردے پہ دکھا سکتے ہیں جن سے ہماری صنعت پیشہ اور زراعت پیشہ آبادی کے معیارِ علم اور معیارِ کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہم سنیما سے تعلیمِ بالغاں کا کام بھی لے سکتے ہیں اور اس کام کو اتنا دلچسپ بنایا جا سکتا ہے کہ ان پڑھ عوام اس سے ذرا نہ اُکتائیں۔

ہم اپنے عوام کو فنِ جنگ کی، سِول ڈیفنس کی، گوریلا وار فیر کی، گلیوں اور کوچوں میں دفاعی جنگ لڑنے کی، اور ہوائی حملوں سے تحفظ کی ایسی تعلیم دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے بہترین طریقے پہ تیار ہو سکیں نیز ہوائی اور بَری اور بحری لڑائیوں کے حقیقی نقشے بھی ان کو دکھا سکتے ہیں تاکہ وہ جنگ کے عملی حالات سے پیشگی باخبر ہو جائیں۔

یہ، اور ایسے ہی بہت سے دوسرے مفید استعمالات سنیما کے ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی تجویز بھی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ابتداءً حکومت کی طاقت اور اس کے ذرائع اس کی پشت پہ نہ ہوں۔ اس کے لیے اوّلین ضرورت یہ ہے کہ عشق بازی اور جرائم کی تعلیم دینے والے فلم یک لخت بند کر دیئے جائیں کیونکہ جب تک اس شراب کی لت زبردستی لوگوں سے چھڑائی نہ جائے گی، کوئی مفید چیز اُن کے منہ کو لگنی محال ہے۔

دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ ابتدا میں مفید تعلیمی فلم حکومت کو خود اپنے سرلے

سے تیار کرانے ہوں گے اور ان کو عوام میں رواج دینے کی کوشش کرنی ہوگی، یہاں تک کہ جب کاروباری حیثیت سے یہ فلم کامیاب ہونے لگیں گے تب ہی سرمایہ اس صنعت کی طرف متوجہ ہوگا۔

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۱۳۷۱ھ۔ مطابق اگست ۱۹۵۲ء)

دعا میں بزرگوں کی حرمت و جاہ سے توسل

سوال :-

میں نے ایک مرتبہ دریافت کیا تھا کہ بجاہ فلاں یا بحرمت فلاں کہہ کر خدا سے دعا کرنے کا کوئی شرعی ثبوت ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا تھا کہ اگرچہ اہل تصوف کے ہاں یہ ایک عام معمول ہے لیکن قرآن و حدیث میں اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہوسکی۔

میں اس سلسلے میں ایک آیت قرآنی اور ایک حدیث پیش کرتا ہوں سورہ بقرہ میں اہل کتاب کے بارے میں آیا ہے وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا۔ یعنی بعثت محمدی سے پہلے یہودی کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس کی تفسیر میں امام راغب نے مفردات میں فرمایا ہے ای یستنصرون اللہ ببعثۃ محمد (یعنی بعثت محمدی کے ذریعے اللہ سے مدد مانگتے تھے) وقیل کانوا یقولون انا لننصر بمحمد

علیہ السلام علی عبدۃ الاوثان (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہودی
یوں کہتے تھے کہ ہم کو بت پرستوں کے مقابلے میں محمد علیہ السلام کے
ذریعہ سے نصرت بخشی جائے گی) وقیل یطلبون من اللہ
بذکرہ الظفر (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے ذریعہ اللہ
سے فتح مانگتے تھے)۔

ترمذی شریف کے ابواب الدعوات میں ایک حسن صحیح غریب
حدیث مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ
میری تکلیف کو دور کر دے۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں دعا
کروں اور اگر صبر کر سکتے ہو تو صبر کرو۔ صبر تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس
نے عرض کیا آپ دعا فرمائیں۔ آپؐ نے اسے اچھی طرح وضو کرنے
کا حکم دیا اور یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اللھم انی اسئلک
واتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ۔ انی توجھت
بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی۔ اللھم شفعہ
فی۔ (خدایا! میں تیرے نبیؐ محمدؐ نبی کے ذریعہ سے تجھ سے دعا
کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں۔ میں نے اپنی اس حاجت
کے لیے اے پروردگار تیری طرف توجہ کی ہے تاکہ تو میری حاجت
پوری کر دے۔ پس اے اللہ! میرے حق میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی
شفاعت قبول فرما)۔

کیا اِس آیت اور اِس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ دُعا میں بحرمتِ سید المرسلینؐ یا بجاہِ نبیؐ، بطفیل نبیؐ یا ببرکت حضورؐ کہنا صحیح اور جائز ہے ؟

جواب :-

آیت مذکورہ کا یہ مطلب میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل آپ کے توسّل سے کفار سے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب وہ ہے جو امام راغبؒ کے پہلے دو اقوال سے بھی نکلتا ہے اور جس کی تائید معتبر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے یہودی اُن پیشین گوئیوں کی بنا پر جو آپ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں، یہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ نبی آئے، اور پھر اس کی بدولت ہمیں کفار پر غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ ابن ہشام کی روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر جب پہلی مرتبہ مدینہ کے چند لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی اور آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ آپس میں کہنے لگے یاقوم تعلموا واللہ انہ للنبی الذی توعدکم بہ الیھود فلا تسبقنکم (ج ۲ ص) "لوگو! جان لو کہ بخدا یہ وہی نبی ہے جس کی آمد کا خوف تم کو یہودی دلایا کرتے تھے۔ پس ایسا نہ ہونے پائے کہ تم سے پہلے وہ اس کے پاس پہنچ جائیں"۔ پھر آگے چل کر ابن ہشام اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے انصارِ مدینہ کے بڈھوں کا یہ قول نقل کرتے ہیں :

فينا والله وفيهم نزلت هذه القصة . كنا قد علونا هم ظهرًا في الجاهلية ونحن اهل الشرك وهم اهل كتاب. فكانوا يقولون لنا ان نبيًّا يبعث الآن نتبعه قد اظل زمانه. نقتلكم معه قتل عاد وارم - فلما بعث الله رسوله صلى الله عليه وسلم من قريش فاتبعناه وكفروا به -

یعنی "یہ آیت ہمارے اور یہودیوں کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے ۔ جاہلیت میں ہم ان پر غالب ہو گئے تھے اور ہم اہل شرک تھے اور وہ اہل کتاب ۔ پس ہم سے وہ کہا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کی آمد کا وقت آپہنچا ہے ۔ ہم اس کی قیادت میں تم کو اس طرح ماریں گے جیسے عاد ارم مارے گئے ۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش سے مبعوث کیا تو ہم نے آپ کی پیروی اختیار کر لی اور انہوں نے آپ کا انکار کر دیا ۔"

رہی جامع ترمذی کی وہ حدیث جو آپ نے نقل فرمائی ہے تو اس کا مضمون تو آپ ہی بتا رہا ہے کہ استدعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی کہ آپ دعا فرمائیں اور آپ نے ہدایت فرمائی کہ اچھا تو اللہ سے دعا کر کہ " خدایا میں تیرے نبی کے واسطے سے تیرے حضور اپنی حاجت لے کر آیا ہوں ۔ تو میرے حق میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش قبول کر ۔" اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کے حق میں دعا فرمائی اور اس سے بھی فرمایا کہ میرے واسطے سے تو بھی اپنی حاجت طلب کر اور میری سفارش قبول کیے

جانے کی بھی دعا مانگ۔ یہ تو دعا کی بالکل ایک فطری صورت ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص مجھ سے کہے کہ فلاں حاکم کے پاس چل کر میری سفارش کر دو اور میں سفارش کرنے کے ساتھ ساتھ اس شخص سے بھی کہوں کہ تو خود بھی حاکم سے عرض کر کہ میں انہیں سفارشی بنا کر لایا ہوں، آپ ان کی سفارش قبول کر کے میری حاجت پوری کر دیں۔ یہ معاملہ اور ہے۔ اس کے برعکس یہ ایک بالکل دوسرا طریق معاملہ ہے کہ کوئی شخص مجھ سے اجازت لیے بغیر خود ہی حاکم کے پاس پہنچ جائے، اور اپنی جو حاجت بھی چاہے میرا واسطہ دے کر پیش کر دے۔ اس دوسری صورت کو آخر پہلی صورت پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ دلیل پہلی صورت کی پیش کرنا اور اس سے جواز دوسری صورت کا نکالنا درست نہیں۔ دوسری صورت کا جواز ثابت کرنے کے لیے تو حضورؐ کا کوئی ایسا قول ملنا چاہیے جس میں آپؐ نے اپنے تمام لیواؤں کو عام اجازت مرحمت فرمائی ہو کہ جس کا جی چاہے اپنی ہر حاجت میرا واسطہ دے کر اللہ سے طلب کر لے۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ۔ فروری ۱۹۵۳ء)

نذر و نیاز اور ایصالِ ثواب

سوال :۔

براہِ کرم مندرجۂ ذیل دو سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں :

(۱) نذر، نیاز اور فاتحہ کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

(ب) کیا ایک دکاندار کسی ایسے شخص کے ہاتھ بھی اپنا مال فروخت کر سکتا ہے، جس کے بارے میں اُسے یقین ہو کہ اس کا ذریعۂ معاش کلیۃً معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے ؟

جواب :۔

(۱) نیاز جو خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لیے کی جائے، بالکل جائز اور موجب اجر و ثواب ہے۔ اور اگر کوئی انفاق فی سبیل اللہ کھانے یا کپڑے یا عطیے کی صورت میں اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر ہمارے کسی متوفی عزیز کی مغفرت فرما دے یا اس انفاق کا ثواب اُس عزیز کو بخش دے تو بجائے خود اس فعل کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ رہا اس کا عزیز کے لیے نافع ہونا تو یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے، وہ چاہے تو اس کے لیے نافع بنا دے ورنہ انفاق کرنے والے کے لیے تو بہرحال نافع ہو گا ہی۔ اگر تلاوت قرآن یا دوسری بدنی عبادت کر کے آدمی یہ دعا کرے کہ اس کا ثواب اُس کے کسی متوفی عزیز کو پہنچ جائے تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا ایصالِ ثواب کی یہ شکل بھی درست ہے یا نہیں۔ بعض ائمہ کے نزدیک یہ درست ہے اور بعض کے نزدیک درست

نہیں ہے۔ میں متعدد شرعی دلائل کی بنا پر مؤخر الذکر مسلک ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔

اگر کوئی مالی یا بدنی عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے کی جائے اور بندگان دین میں سے کسی کو اس غرض کے لیے اُس کا ثواب ایصال کیا جائے کہ وہ بزرگ اس ہدیے سے خوش ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہدیہ بھیجنے والے کے سفارشی بن جائیں تو یہ ایک ایسا مشتبہ فعل ہے جس میں جواز و عدم جواز بلکہ گناہ اور فتنے تک کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو جاتی ہے اور میں کسی پرہیزگار آدمی کو یہ مشورہ نہ دوں گا کہ وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالے۔

رہے وہ کھانے جو صریحًا کسی بزرگ کے نام پر پکائے جاتے ہیں اور جن کے متعلق بالفاظِ صریح یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں بزرگ کی نیاز ہے، اور جن کے متعلق پکانے والے کی نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ یہ ایک نذرانہ ہے جو کسی بزرگ کی روح کو بھیجا جا رہا ہے، اور جن کے متعلق ہمارے ہاں طرح طرح کے آداب مقرر ہیں اور بے حرمتی کی مختلف شکلیں ممنوع قرار پائی ہیں اور ان نیازوں کی برکات اور فوائد کے متعلق گہرے عقائد پائے جاتے ہیں تو مجھے ان کے حرام اور گناہ ہونے بلکہ عقیدۂ توحید کے خلاف ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

(ب) اگر حرام ذریعۂ معاش رکھنے والا شخص کسی دکاندار سے کوئی چیز خریدنا چاہے تو دکاندار کے لیے اس کے بیچنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ دکاندار کے پاس جس راستے سے قیمت پہنچے گی وہ حلال ہے۔ گندگی اور حرمت پیسے میں نہیں بلکہ کسبِ معاش کے طریقے میں ہے۔ جس شخص کے پاس حرام

ذریعہ سے پیسہ آیا ہے، وہ اسی کے لیے حرام ہے۔ دوسرے شخص کو وہی پیسہ اگر حلال راستے سے پہنچے تو اس کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۱۳۷۱ھ۔ اگست ۱۹۵۲ء)

نماز کی قصر و قضا

افسوس ہے کہ عرب ممالک کے نوجوان نہ تو خود دین کا کافی علم رکھتے ہیں اور نہ وہ فقہائے مجتہدین میں سے کسی کا اتباع ہی کرتے ہیں اسی وجہ سے آئے دن ان کے عجیب عجیب اجتہادات سننے میں آتے رہتے ہیں۔ مسافر کے معاملہ میں امام شافعیؒ امام احمدؒ اور ایک روایت کی رُو سے امام مالکؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جو شخص کسی مقام پر چار دن یا اس سے زیادہ ٹھیرنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہیئے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کا مسلک یہ ہے کہ دس دن یا اس سے زیادہ ٹھیرنے کی نیت مسافر کو مقیم بنا دیتی ہے۔ امام اوزاعیؒ بارہ دن کی اور امام ابوحنیفہؒ پندرہ دن کی حد مقرر کرتے ہیں۔ علماء اسلام میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اپنے شہر سے باہر نکل کر کسی دوسرے مقام پر کوئی شخص چاہے مہینوں اور برسوں رہے مگر وہ مسافر ہی رہے گا اور قصر کرتا رہے گا۔ البتہ فقہاء یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی مقام پر اس طرح رکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کے کوچ کر جانے کا امکان ہو اور ٹھیرنے کی نیت نہ ہو، تو خواہ وہاں اُسے مہینوں رکا رہ جانا پڑے وہ قصر کر سکتا ہے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں پندرہ دن اور فتح مکہ کے

موقع پر مکہ میں اٹھارہ دن قصر فرمایا (مسند احمد و ابو داؤد) اور انہی وجوہ سے صحابہ کرام کا لشکر آذربیجان کی مہم میں ۶ مہینے قصر کرتا رہا۔ (مسند احمد)

یہ بات بھی سخت حیرت انگیز ہے کہ یہ لوگ نماز کی قضا کے قائل نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ چیز بکثرت احادیث سے ثابت ہے اور تمام فقہائے اسلام بالاتفاق اس کے قائل ہیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ایک قابلِ ذکر فقیہ بھی اس کا قائل نہیں ہوا ہے کہ روزے کی قضا تو واجب ہے مگر نماز کی قضا واجب نہیں۔ بخاری، مسلم، نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں متعدد احادیث حضرت انسؓ، ابو ہریرہؓ اور ابو قتادہ انصاریؓ سے مروی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نماز کو انسان بھول جائے یا سو تا رہ جائے اور نماز کا وقت نکل گیا ہو، تو جس وقت بھی اسے یاد آئے یا وہ بیدار ہو اُسے وہ چھوٹی ہوئی نماز پڑھ لینی چاہیئے۔

یہ تو ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قولی حکم۔ رہا آپؐ کا اپنا فعل، تو ابو سعید خدریؓ، جابر بن عبد اللہؓ اور عمران بن حصین سے متعدد واقعات مسند احمد، بخاری، مسلم اور نسائی میں منقول ہیں جن میں وہ بتاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے چھوٹی ہوئی نمازیں ادا کی ہیں۔

ایک سفر میں رات بھر چل کر آخر وقت میں قافلے نے پڑاؤ کیا اور اترتے ہی سب پر نیند غالب ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا تو اس کی گرمی سے لوگ بیدار ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اذان دلوائی اور جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔ غزوۂ خندق میں ایک روز عصر کی نماز قضا ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے وقت ادا کی۔ اور ایک اور دن اسی غزوہ میں ظہر، عصر اور

مغرب کی نمازیں قضا ہوئیں اور ایسے وقت یہ تینوں نمازیں ادا کی گئیں جب کہ عشاء کا وقت شروع ہو رہا تھا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ جو نماز چھوٹ گئی وہ معاف ہے؟

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۶۲ء)